اگست 2009ء

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

اے ایمان والو! روزہ اس طرح تم پر لکھ دیا گیا ہے (فرض کر دیا گیا ہے) جس طرح تم سے پہلے والوں پر لکھ دیا گیا تھا۔۔۔۔ تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ «البقرہ ۱۸۳»
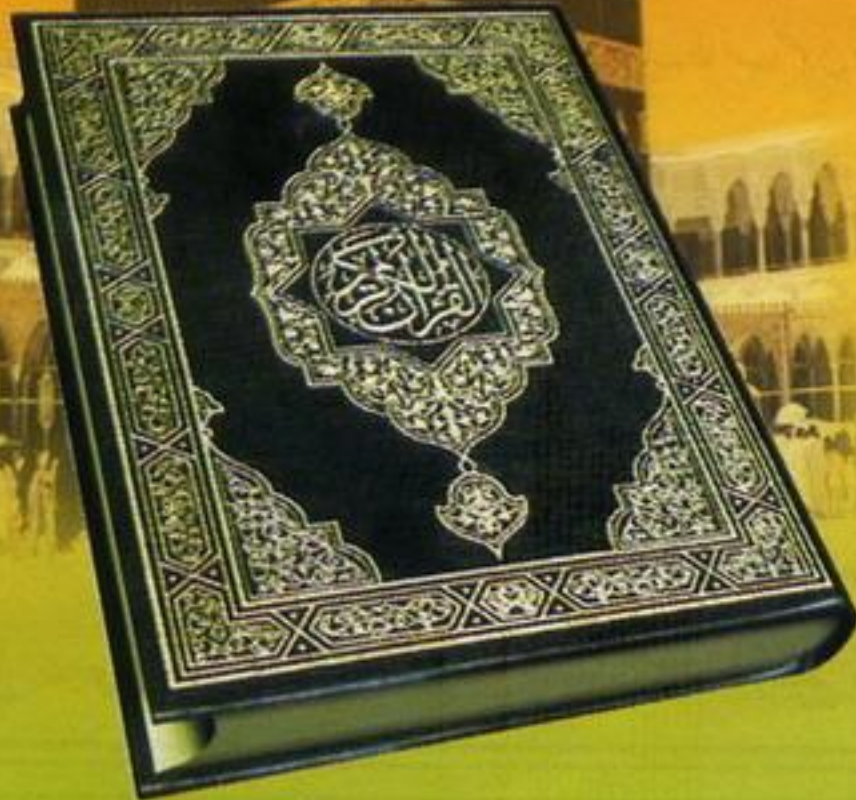
زیر انتظام جامعہ علمیہ سلطان المدارس الاسلامیہ

زاہد کالونی عقب جوہر کالونی، سرگودھا

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے؟

☆ ہر شخص کو ایک نہ ایک دن عمل کی دنیا سے رخصت ہونا ہے اور جزا کے عالم میں سمانا ہے یہاں جو کچھ اور جیسے اس نے عمل کیے اسی لحاظ سے اس کو مقام ملنا ہے خوش نصیب ہیں وہ افراد جنہوں نے اپنے مستقبل پر غور کیا اور اس چند روزہ زندگی میں ایسے کام کیے جس سے ان کی زندگی زیست ہوگئی۔

☆ آپ بھی اگر چاہتے ہیں کہ قیامت تک آپ کے نامہ اعمال میں نیکیاں جاتی رہیں اور ثواب میں اضافہ ہوتا رہے تو فی الفور حیثیت قومی تعمیراتی کاموں میں دلچسپی لیں اور قومی تعمیراتی اداروں کو فعال بنا کر عنداللہ ماجور و عندالناس مشکور ہوں۔

☆ ان قومی اداروں میں سے ایک ادارہ جامعہ علمیہ سلطان المدارس الاسلامیہ سرگودہا بھی ہے آپ اپنے قومی ادارے جامعہ علمیہ سلطان المدارس الاسلامیہ کی اس طرح معاونت فرما سکتے ہیں۔

1۔ اپنے ذہین و فطین بچوں کو اسلامی علوم سے روشناس کرانے کیلئے ادارہ میں داخل کروا کر۔

2۔ طلبہ کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر کے کیونکہ فرمان معصوم ہے جس کسی نے ایک طالب علم کی ٹوٹے ہوئے قلم سے بھی مدد کی گویا اس نے ستر مرتبہ خانہ کعبہ کو تعمیر کیا۔

3۔ ادارہ کے تعمیراتی منصوبوں کی تکمیل کیلئے سیمنٹ، بجری، ریت، اینٹیں وغیرہ مہیا فرما کر۔

4۔ ادارہ کی طرف سے ماہانہ شائع ہونے والا رسالہ "دقائق اسلام" کے باقاعدہ ممبر بن کر اور بروقت سالانہ چندہ ادا کر کے۔

5۔ ادارہ کے تبلیغاتی پروگراموں کو کامیاب کر کے۔

آپ کی کاوشیں اور آپ کا خرچ کیا ہوا پیسہ صدقہ جاریہ بن کر آپ کے نامہ اعمال میں متواتر اضافے کا باعث بنتا رہے گا۔

ترسیل زر کیلئے

پرنسپل جامعہ علمیہ سلطان المدارس الاسلامیہ

زاہد کالونی عقب جوہر کالونی سرگودہا فون 0301-6702646

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

دقائق اسلام

سرگودھا

جلد: ۱۳ اگست ۲۰۰۹ء شمارہ: ۸

فہرست مضامین

مدیر اعلیٰ: ملک ممتاز حسین اعوان

مدیر: گلزار حسین محمدی

ناشر: ملک ممتاز حسین اعوان

مطبع: انصار پریس بلاک ۱۰

مقام اشاعت: سلطان المدارس سرگودہا

کمپوزنگ: بشیر

زرتعاون 200 روپے

لائف ممبر 5000 روپے

اتحاد بین المومنین والمسلمین

عالمِ اسلام اس وقت جن مشکلات کا شکار ہے وہ کسی پر مخفی و مستور نہیں پوری دنیا میں مسلمانوں اور ان کے ممالک پر مظالم ڈھائے جارہے ہیں مگر اھل اسلام ابھی تک اختلافات کا شکار ہیں اگر عالم اسلام میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوجائے اور باہمی میل سے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی عالمی طاقت ان کا نقصان نہیں کرسکتی مگر کیا کیا جائے معمولی اور فروعی اختلافات کو ہوا دیکر آپس میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔

مملکت پاکستان میں بسنے والے شیعیان حیدر کرار پر گزشتہ برسوں سے متواتر مظالم کا سلسلہ جاری ہے ہزاروں بے گناہ اور بے جرم لوگ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہیں بالخصوص ڈیرہ اسماعیل خان پارہ چنار اور کرم ایجنسی میں مومنین کا جینا دوبھر کردیا گیا ہے مگر قومی سطح پر اس خونریزی کے سدباب کے لئے تا حال کوئی موثر اقدام نہیں کیا گیا اس کی بڑی وجہ بھی قوم میں گروہ بندی اور آپس کی منافرت ہے مجالس عزا میں تفریق پیدا کردی گئی ہے ایک طبقہ جس کا ذریعہ معاش ہی قوم کی تفریق میں ہے اتحاد کی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔

اکابرین قوم سے دردمندانہ اپیل ہے کہ تمام اختلافات بھلا کر قوم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں بزرگ علمائے کرام اور ذمہ داران قوم اپنا خصوصی اثر و رسوخ استعمال کریں اور روٹھے ہوئے لوگوں کو راضی کریں تا کہ قوم متحد ہو کر اپنا کھویا ہوا وقار واپس لا سکے۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ظالموں کے ہاتھوں جان بحق ہونے والے لوگوں کے یتیم بچے بچیاں اور بیوہ عورتیں کس مپرسی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہیں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں افراد قوم میں قومی سوچ پیدا کرنے کے لئے اتحاد کی فضا کو برقرار رکھا جائے اور رفاہی اور فلاحی اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے تمام مکاتب فکر کے ہسپتال، سکول، کالج اور بلڈ بنک ہر چھوٹے بڑے شہر میں موجود رہیں مگر ہمارے غریب اور بیچارے مومنین ان سہولیات سے محروم ہیں سرمایہ دار اور اہل ثروت لوگ اس طرف توجہ فرمائیں ہر شہر میں نہ سہی کم از کم ضلعی سطح پر ان تمام سہولیات کا انتظام کیا جائے۔

ان تمام مسائل کا حل اتحاد بین المومنین میں ہے اگر اب بھی ہمارے اکابرین اور علمائے نے اس طرف توجہ نہ دی تو قوم مزید زبوں حالی کا شکار ہوجائیگی۔

خدارا حالات کی نزاکت کا احساس کریں اور پارہ پارہ شدہ قوم کو یکجا کر کے عزت کی زندگی سے جینا اور مرنا سکھایا جائے۔

ولایت علی علیہ السلام سے متمسک تمام افراد ایک لڑی میں پروئے جائیں اور علم و عمل کی طرف قدم بڑھائیں اسی میں ہماری فلاح اور کامیابی ہے۔

انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ بین المذاہب اتحاد کیا جائے اسلامی تعلیمات اسکی تائید کرتی ہیں کیونکہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے اسلام جیو اور جینے دو کا درس دیتا ہے لہذا جہاں تک ہوسکے اسلامی ایمانی اور انسانی بھائیوں سے اچھے تعلقات رکھے جائیں اور تصادم سے گریز کیا جائے۔

باب العقائد

صفات ذات اور صفات فعل کا بیان

از قلم آیۃ اللہ علامہ محمد حسین نجفی موسس و پرنسپل سلطان المدارس

بالفاظ سہل و سادہ صفاتِ خداوندی کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) کیونکہ وہ صفت یا تو ذات ایزدی کے لئے ہمیشہ ثابت ہوں گی

(۲) یا ہمیشہ اس سے منفی ہوں گی

(۳) یا کبھی ثابت اور کبھی منفی ہوں گی

پہلی قسم کی صفات کا تعلق چونکہ ذات باری سے ہے اس لئے ان کو صفاتِ ذاتیہ اور صفاتِ کمالیہ۔ صفات جمالیہ۔ صفاتِ حقیقیہ اور صفاتِ ذات الاضافہ کہا جاتا ہے۔

اور یہ بنا بر مشہور آٹھ ہیں۔ قدرت، علم، حیات، ارادہ، ادراک، قدم، تکلم، صدق۔ اگرچہ عند التحقیق خداوند عالم کی صفاتِ کمالیہ بے شمار اور غیر محدود ہیں۔ جیسا کہ اس مطلب پر سابقہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جاچکی ہے اور یہ امر بھی ثابت کیا جاچکا ہے کہ چونکہ یہ صفات عین ذات ہیں۔ یعنی ذات اور صفات میں کسی وقت بھی تفکیک و جدائی متصور نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جس طرح ذات ایزدی کی کنہ حقیقت تک ہمارے عقول و افہام کی رسائی ممکن نہیں۔ اسی طرح ان صفات کی حقیقت تک بھی رسائی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر حضرت منصف علام نے فرمایا ہے کہ جب ہم خداوند عالم کو ان صفات کے ساتھ متصف کرتے ہیں تو درحقیقت مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان صفات جمیلہ کی اضداد کی نفی کی جائے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خداوند عالم ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جاہل نہیں ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا قادر ہے۔ تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عاجز نہیں ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ورنہ ہم علم و قدرت خداوندی کی اصل حقیقت و کیفیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس مطلب جلیل کی تفصیل بھی پہلے گذر چکی ہے دوسری قسم کی صفات کو صفات فعلیہ اور صفات اضافات محضہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق فعلِ خداوندی کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ ذات کے ساتھ جیسے خالق و رازق و محی اور ممیت وغیرہ صفات۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ خداوند عالم سے خلق و رزق وغیرہ افعال صادر نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس وقت وہ خالق و رازق اور محی و ممیت نہیں تھا۔ ہاں بعد میں جب اس نے یہ کام انجام دیئے تو وہ خالق و رازق کہلایا۔ اسی جامع بیان سے صفاتِ ذاتیہ اور صفات فعلیہ کا باہمی فرق بھی نمایاں ہوجاتا ہے۔ اس مقصد کی بقدر ضرورت توضیح یہ ہے کہ وہ صفاتِ جلیلہ جن کا ذات باری میں ہمیشہ پایا جانا ضروری ہو۔ اور ان کی اضداد سے اس کا متصف ہونا بوجہ لزوم نقص در ذات درست نہ ہو۔ انہیں صفات ذات کہا جاتا ہے۔ جیسے علم و قدرت اور حیات و امثالہا کیونکہ خلاق عالم کو کسی وقت بھی ان صفات کی اضداد یعنی جہل و عجز اور موت سے متصف نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس سے اس کی ذات میں نقص لازم آتا ہے اور وہ صفات جن سے اس کا ہمیشہ متصف ہونا ضروری نہ ہو بلکہ ان

کی ضد اس سے بھی اسے متصف کرنا صحیح ہو کیونکہ اس سے ذات باری میں کوئی نقص لازم نہیں آتا تو ان کی صفتِ فعل کہا جاتا ہے۔ جیسے خلق و رزق و امثالہا۔ کیونکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ایک وقت وہ تھا کہ خداوند عالم موجود تھا۔ لیکن بالفعل خالق اور رازق نہ تھا بلکہ اب بھی بعض چیزوں کا خالق نہیں ہے یہ ہے صفات ذات جو کہ عین ذات ہیں اور صفات فعل ہیں جو کہ زائد بر ذات ہیں۔

باہمی فرق جو کہ مصنف علام کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے اور حضرت ثقۃ الاسلام کلینی قدس سرہ نے بھی اُصول کافی ہیں ان کے درمیان یہی فرق بیان فرمایا ہے۔ اور بھی بہت سے محققین نے اسی طرح افادہ فرمایا ہے بہر حال صفت ذات صفات باری کا مبحث بہت طویل الذیل اور معرکۃ الآراء ہے۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی ضرورت مزید تفصیل کے شائقین کتب مبسوطہ مثل عماد الاسلام وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔ هذا بیان للناس و هدًی و موعظة للمتقین۔

باب الاعمال

نماز پنجگانہ کے اوقات کا بیان

از قلم آیۃ اللہ علامہ محمد حسین نجفی موسس و پرنسپل سلطان المدارس

فقہ کے منجملہ سخت ترین پیچیدہ مسائل کے ایک اوقات نماز کا مسئلہ بھی ہے اس میں چند بڑے شدید اختلافات ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہر نماز کے کتنے کتنے اوقات ہیں دو، دو یا تین تین یا چار چار؟ ہر نماز کا وقت فضیلت شروع کب ہوتا ہے اور ختم کب ہوتا ہے؟ وقتِ اجزاء یا وقت عذر کی انتہا کہاں ہے؟ پھر واجبی نماز کے مقررہ نوافل کا وقت کب شروع ہو کر کب ختم ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ ہم نے آئمہ اطہار کے اخبار و آثار اور اقوال علماء ابرار کے بحار میں شناوری کر کے اپنی وسعت نظر و بضاعت کے مطابق جو لئالی آبدار حاصل کئے ہیں ان کو بڑے ایجاز و اختصار کے ساتھ ذیل میں حوالہ قرطاس کرتے ہیں۔ و علی اللہ التوکل الی یوم القرار۔

ہر نماز کے دو وقت ہیں:

ہر ہر نماز کے علیحدہ علیحدہ اوقات لکھنے سے پہلے اجمالاً اتنا معلوم ہونا چاہیئے کہ پنجگانہ نمازوں میں سے ہر نماز کے دو دو وقت ہیں بنابر مشہور ان کا نام یہ ہیں:

(۱) وقت فضیلت اور (۲) وقت اجزاء (جس میں نماز ہو تو جاتی ہے مگر ثواب کم ملتا ہے) اور بناء بر تحقیق ان کے نام یہ ہیں: (۱) وقت مختار یعنی اس آدمی کا وقت جس کو کوئی شرعی عذر درپیش نہ ہو تو اسے اسکی پابندی کرنی چاہیئے، (۲) وقت مضطر و ذی الاعذار (یعنی شرعی عذر رکھنے والے لوگوں کا وقت جیسے بیمار، سہو و نسیان کا شکار یا سویا ہوا آدمی وغیر ہم) یہ لوگ اس وقت تک نماز کو موخر کر سکتے ہیں۔

وقت مختص کی بحث:

اور یہ جو مشہور بین الفقہاء ہے کہ ہر نماز کے ایک تیسرا مختص وقت ہوتا ہے جس میں اس نماز کے سوا اور کوئی نماز نہیں پڑھی جا سکتی جیسے اول زوال کے بعد کی چار رکعت پڑھنے کی مقدار ظہر سے خاص اور غروب آفتاب سے پہلے چار رکعت پڑھنے کا وقت عصر سے مختص ہے اور اسی طرح شرعی غروب کے بعد تین رکعت پڑھنے تک مغرب کے ساتھ اور نصف شب سے پہلے چار رکعت پڑھنے کا وقت عشاء سے خاص ہے اور اس کا ثمرہ و نتیجہ یہ ہے کہ اگر عمداً یا سہواً اس مختص وقت میں کوئی دوسری نماز پڑھ لی جائے۔ جیسے ظہر کے مختص وقت میں عصر یا عصر کے مختص وقت میں ظہر تو وہ نماز باطل سمجھی جائے گی۔ اگرچہ یہ مطلب ایک مرسلہ روایت سے ماخوذ ہے مگر اصح یہ ہے کہ یہ اختصاص ثابت نہیں ہے بلکہ سب مشترکہ وقت ہے۔

کیونکہ اس ایک مرسلہ روایت کے بالمقابل متعدد روایات صحیحہ موجود ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ اذا زالت الشمس دخل الوقتان الظھر و العصر و اذا غابت الشمس دخل الوقتان المغرب ولعشاء۔ جب زوال آفتاب ہو جائے۔ تو ظہر و عصر کا وقت داخل ہو جاتا ہے اور جب سورج غروب ہو جائے تو مغرب

عشاء کا وقت داخل ہوجاتا ہے۔ (من لایحضرہ الفقیہ) بعض روایات میں یہ تتمہ بھی مذکور ہے۔ الا ان هذه قبل هذه مگر یہ (ظہر اور مغرب) اس (عصر و عشاء) سے پہلے پڑھی جائے گی (فروع کافی۔تہذیب الاحکام)

اگر چہ ان روایات میں فی الجملہ تاویل کی گنجائش ہے مگر ان سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ زوال ہوتے ہی دونوں نمازوں کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔ اسی طرح غروب کے بعد مغرب عشاء دونوں کا وقت داخل ہوجاتا ہے اور دونوں نمازوں کیلئے صلاحیت رکھتا ہے۔ ہاں البتہ پڑھتے وقت متوجہ ہونے کی صورت میں ترتیب کا ملحوظ رکھنا واجب ہے اور جان بوجھ کر اس کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر سہواً تقدیم و تاخیر ہوجائے تو نماز صحیح ہوگی۔ اور اپنے وقت میں پڑھی ہوئی نماز متصور ہوگی۔ تاہم احوط یہ ہے کہ قول مشہور کے مطابق عمل کیا جائے بالخصوص آخری وقت میں واللہ العالم

نماز ظہر کے ہر دو وقت:

اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ زوال آفتاب ہوتے ہی نماز ظہر کا وقت شروع ہوجاتا ہے اور اسی وقت اس کو پڑھا بھی جاسکتی ہے ہاں اختلاف اس میں ہے کہ اس کا وقت فضیلت یا وقت مختار (گذشتہ وضاحت کے مطابق) کب شروع ہوجاتا ہے اور کب تک رہتا ہے؟ مشہور یہ ہے کہ اول زوال سے لے کر ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہونے تک باقی رہتا ہے اس کے بعد وقت اجزائی شروع ہوتا ہے اور کب تک رہتا ہے؟ مشہور یہ ہے کہ اول زوال سے لے کر ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہونے تک باقی رہتا ہے اس کے بعد وقت اجزائی شروع ہوجاتا ہے جو اس وقت تک باقی رہتا ہے کہ غروب میں صرف چار رکعت کا فاصلہ باقی رہ جائے۔

مگر یہ مثل والا قول صرف دو روایات سے ماخوذ ہے جو اہل خلاف کے نظریہ کے موافق ہونے کی وجہ سے تقیہ پر محمول کی گئی ہیں۔ جیسا کہ اختلاف روایات کے وقت قاعدہ ہے لہذا اظہر یہ ہے کہ وقت فضیلت اول زوال سے لیکر آدمی کا سایہ ایک ہاتھ یا دو قدم ہونے تک رہتا ہے اور ایک با اختیار آدمی کو اس سے نماز موخر نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد عذر شرعی رکھنے والوں کا وقت شروع ہوتا ہے جو مذکورہ بالا وقت اجزائی تک باقی رہتا ہے۔

نماز عصر کے ہر دو وقت:

مشہور یہ ہے کہ جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہوجائے تب فضیلت عصر کا وقت شروع ہوتا ہے۔ جو سایہ کے دوگنا ہونے تک باقی رہتا ہے۔ اگر اس سے پہلے پڑھی جائے یا اس کے بعد غروب تک تو یہ وقت فضیلت کے خلاف ہوگی مگر حسب سابق اظہر یہ ہے کہ جہاں ظہر کا وقت فضیلت یا وقت اختیاری ختم ہوجاتا ہے یعنی جب آدمی کا سایہ ایک ہاتھ یا دو قدم ہوجائے اس وقت سے لیکر سایہ کے دو ہاتھ یا چار قدم ہونے تک باقی رہتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر چیز کے طول کے مطابق اس کے 2/7 حصہ سے لیکر 4/7 حصہ سایہ ہونے تک باقی رہتا ہے اس کے بعد غروب تک وقت اجزائی یا صاحبان عذر کا وقت ہے۔

توضیح: اس تمام تحقیق و تدقیق کے باوجود اگر کوئی شخص مثل و مثلین والے قول پر عمل کرنا چاہے۔ (کہ کسی چیز کا سایہ اس کے برابر ہونے تک فضیلت ظہر اور اس کے بعد دو برابر ہونے تک فضیلت عصر ہے) تو کرسکتا ہے۔ کما هو المشهور عند الفريقين و ان كان قول الثاني هو المختار و هو الاوفق بالاحتياط۔ واللہ العالم والعاصم۔

باب التفسیر

جنگ احد کے واقعات اور مسلمانوں کے حالات کا تذکرہ

از قلم آیۃ اللہ علامہ محمد حسین نجفی موسس و پرنسپل سلطان المدارس

سورہ آل عمران

اذ تصعدون و لا تلوون علی أحدٍ و الرسول یدعوکم فی أُخراکم فأثابکُمْ غمًا بغم لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم ولا ما أصابکم واللّٰہُ خبیر بما تعملون (۱۵۳) ثم انزل علیکم من بعد الغم امنۃ نعاسا یغشی طائفۃ منکم و طائفۃ قد اھمتھم انفسھم یظنون باللّٰہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ یقولون ھل لنا من الأمر من شیء قل ان الامر کلہ للّٰہ یخفون فی انفسھم ما لا یبدون لک یقولون لو کان لنا من الأمر شیءٌ ما قتلنا ھاھنا قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الی مضاجعھم و لیبتلی اللّٰہ ما فی صدورکم و لیمحص ما فی قلوبکم واللّٰہ علیمٌ بذات الصدور (۱۵۴)

ترجمہ:

(اس وقت کو یاد کرو) جب تم بے تحاشا بھاگے چلے جارہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ حالانکہ پیغمبرؐ تمہارے پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے۔ (تمہاری اس روش کی وجہ سے) خدا نے تمہیں ثواب کے بدلے رنج پر رنج دیا۔ تاکہ (آئندہ) جو چیز تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اس پر ملول نہ ہو اور جو مصیبت در پیش ہو اس پر رنج نہ کرو۔ اور اللہ تمہارے سب اعمال سے خود باخبر ہے۔ (۱۵۳) پھر اس (خدا) نے رنج و غم کے بعد نیند کی صورت میں تم پر سکون و اطمینان اتارا۔ جو تم میں سے ایک گروہ پر طاری ہوگئی۔ اور ایک گروہ ایسا تھا کہ جسے صرف اپنی جانوں کی فکر تھی وہ اللہ کے ساتھ ناحق زمانہ جاہلیت والے گمان کر رہا تھا وہ کہہ رہا تھا۔ کہ آیا اس معاملہ میں ہمیں بھی کچھ اختیار ہے؟ کہہ دیجئے۔ ہر امر کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ یہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی باتیں چھپائے ہوئے ہیں۔ جن کا آپ سے اظہار نہیں کرتے کہتے ہیں کہ اگر ہمارے ہاتھ میں بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے۔ کہہ دیجئے! اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو بھی جن کے لئے قتل ہونا لکھا جا چکا تھا وہ ضرور اپنے مقتل کی طرف نکل کر جاتے (یہ سب کچھ اسلیئے ہوا) خدا اسے آزمائے جو کچھ تمہارے سینوں کے اندر ہے اور نکھار کے سامنے لائے اس (کھوٹ) کو جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ سینوں کے اندر کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔ (۱۵۴)

اس آیت میں جنگ احد میں مسلمانوں کی افراتفری کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ جس کی تفصیل قبل ازیں آیت واذ غدوت کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔ ہموار وادیوں میں چلنے کو اصعاد اور بلندی پر چڑھنے کو صعود کہا جاتا ہے (مفرادات راغب) "و لا تلوون

لوی یلوی لیاً رمی یرمی رمیا'' کے باب سے ہے جس کے معنی گردن مروڑ کے پیچھے دیکھنا ہے (ایضاً) خدا نے تمہیں رنج پر رنج اور غم پر غم اسلیئے دیا کہ تا کہ آئندہ محتاط ہو جاؤ اور ایسی صورت حال کا سامنا کرنے کے عادی ہو جاؤ۔ کہ جو ہاتھ سے نکل جانے والی چیز پر ملول نہ ہو اور پیش آمدہ مصیبت پر رنج نہ کرو بلکہ پورے صبر وضبط اور ثابت قدمی سے کام لو۔ ان اللہ مع الصابرین۔

جنگ احد میں پیغمبر اسلام کے ہمراہ دو قسم کے لوگ تھے ایک اسلام و قرآن کی صداقت و سچائی پر مکمل ایمان رکھنے والے۔ دوسرے منافقین۔ اگر چہ ابن ابی (رئیس المنافقین) اپنے تین سو ہمراہیوں کے ساتھ راستہ سے ہی واپس لوٹ گیا تھا۔ مگر ایک مختصر سی جماعت (معتب بن قشیر وغیرہ) آنحضرتؐ کے ہمراہ تھی۔ جنگ میں مجاہد مسلمان زخموں سے چور اور اعزاز احباب کے داغ مفارقت سے مجبور اور خوف وہراس اور حوصلہ شکن حالات سے مجبور تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں بے چینی کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ مگر خدا نے اپنے خاص فضل وکرم سے ان پر نیند غالب کر دی جو کہ ان کیلئے نعمت غیر مترقبہ تھی جس سے انکی تھکاوٹ واکتاہٹ دور ہوگئی اور وہ تازہ دم ہو گئے۔ مگر خدا نے دوسرے گروہ کو اس نعمت سے محروم رکھا۔ جسے نہ بانی اسلام کی فکر تھی اور نہ جنگ میں کامرانی کی ہاں البتہ اسے اگر فکر دامنگیر تھی تو صرف اپنی سلامتی کے ساتھ اپنے گھر پہنچنے کی وہ اللہ کے بارے میں زمانہ جاہلیت والے گمان کر رہا تھا اور جنگ کا نقشہ بدلہ ہوا دیکھ کر جو کچھ نفاق دل میں چھپا ہوا تھا وہ سب کچھ زبان سے باہر اگل دیا۔ انہوں نے جو بے بنیاد باتیں کیں وہ قرآن نے سب بیان کر دی ہیں۔ ان لوگوں کی انہی بے سروپا باتوں میں سے ایک یہ بھی تھی۔ کہ اگر ہمارے ہاتھ میں کچھ اختیار ہوتا تو ہم (یعنی جو ہم سے) یہاں مارے گئے ہیں وہ قتل نہ ہوتے انکی اس بات کے جواب میں خدا فرماتا ہے۔ قل لو کنتم الایہ کہہ دیجئے۔ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لیے قتل ہونا (شہید ہونا) لکھا جا چکا تھا وہ خود اپنی قتل گاہ کی طرف چل کر جاتے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ خدا سے آزمائے اور لوگوں پر ظاہر فرمائے جو کچھ تمہارے سینوں کے اندر ہے۔ اور نکھار کر سامنے لائے اس کھوٹ کو جو تمہارے دلوں میں ہے۔ واللہ علیم بذات الصدور

باب الحدیث

برادر ایمانی کی حاجت برآری میں کدوکاوش کا اجر وثواب

از قلم آیۃ اللہ علامہ محمد حسین نجفی موسس و پرنسپل سلطان المدارس

خدائے علیم وحکیم نے اپنی حکمت بالغہ سے انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی انسان بنفس نفیس اپنے سب کام انجام نہیں دے سکتا۔ بلکہ قدم قدم دوسرے بنی نوع انسان کے مخلصانہ تعاون کا محتاج ہوتا ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ شریعت مقدسہ اسلامیہ نے کار خیر میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا نہ صرف حکم دیا ہے بلکہ اس کا بڑا اجر وثواب بھی بتایا ہے۔ اور کار بد میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کی مناہی فرمائی ہے ارشاد ہے۔ تعاونوا علی البر و التقوی ولا تعاونوا علی الاثم و العدوان کہ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔ اور گناہ وعدوان کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔ اور آئمہ اہلبیت نے بھی اس سلسلہ میں اس کار خیر کے بڑے بڑے ثواب بیان فرمائے ہیں۔

۱۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا کہ خداوند عالم کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ میرے بندوں سے کچھ ایسے بندے بھی ہیں کہ وہ کچھ نیکی کا کام کرتے ہیں اور میں جنت میں ان کو سرداری عطا کرتا ہوں۔ جناب موسیٰ نے عرض کیا اے میرے پروردگار وہ خاص نیکی کیا ہے؟ فرمایا وہ اپنے برادر مومن کی حاجت برآری کے لیئے اسکے ساتھ چل کر جانا ہے۔ خواہ حاجت پوری ہو یا نہ ہو (اصول کافی)

۲۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا جو شخص اپنے برادر مومن کی حاجت کیلئے قربۃ الی اللہ چلا جائے یہاں تک کہ اسکی حاجت پوری ہو جائے تو اسے حج وعمرہ مرورہ ومقبولہ اور اشہر حرم میں دو ماہ کے روزے رکھنے اور ان میں دو بار مسجد میں اعتکاف بیٹھنے کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ اور اگر وہ کوشش تو کرے مگر حاجت برآری نہ ہو سکے تو پھر بھی خود اسکے نامہ اعمال میں ایک حج مرور کا ثواب درج فرماتا ہے۔ (ایضا)

۳۔ انہی حضرت سے منقول ہے فرمایا جو شخص کسی برادر ایمانی کی حاجت برآری کیلئے چل کر جائے اسکے لئے دس حسنات لکھے جاتے ہیں دس گناہ معاف کئے جاتے ہیں اس کے درجے بلند کئے جاتے ہیں اور دس غلام آزاد کرانے کا ثواب ملتا ہے اور یہ کام مسجد الحرام میں اعتکاف مہینے کے اعتکاف سے افضل ہے۔ (ایضاً)

۴۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا زمین خدا میں اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے خاص بندے موجود ہیں۔ جو لوگوں کی حاجت برآری کیلئے کوشش کرتے ہیں وہ قیامت کے دن امن وامان میں ہوں گے۔ اور جو شخص کسی مومن کو خوش کرے خدا بروز قیامت اسکے دل کو خوش کرے گا۔ (ایضا)

۵۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا اگر میں کسی مسلمان بھائی کی حاجت برآری کی خاطر چل کر جاؤں تو یہ بات مجھے ایک ہزار غلام آزاد کرنے اور جہاد فی سبیل اللہ میں ایک ہزار زیندار گھوڑوں پر مجاہد بھیجنے سے زیادہ پسند ہے (ایضا) سبحان اللہ اللہ اکبر۔ والحمد للہ

باب المسائل

سوالات کے جوابات

برطابق فتوئی آیت اللہ محمد حسین نجفی دام ظلہ العالی

مختلف سوالات کے جوابات

گذشتہ سے پیوستہ عالی جناب سید عارف حسین نقوی ایم اے۔ ڈیرہ اسماعیل خان

سوال ۱۲۴: ''کیا معجزہ کے رونما ہونے میں صاحب معجزہ کی شخصیت اور اس کا ارادہ داخل ہوتا ہے یا فقط صاحب معجزہ معجزہ کی رونمائی کا پردہ ہوتا ہے''

الجواب: باسمہ سبحانہ یہ بات اپنے مقام پر یعنی علم کلام میں دلائل عقلیہ وشرعیہ سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ معجزہ کا حقیقی فاعل جسکی قوت قاہرہ اور قدرت کاملہ سے معجزہ کا ظہور ہوتا ہے وہ خداوند عالم کی ذات ہے۔ لہٰذا معجزہ کی خدا کی طرف نسبت حقیقی ہوتی ہے اور چونکہ وہ نبی وامام کی استدعا و دعا پر ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا انکی طرف بھی اسکی نسبت ہوتی ہے۔ مگر وہ مجازی ہوتی ہے۔ جہاں تک معجزہ نما کی شخصیت کا تعلق ہے وہ صرف یہ ہے کہ معجزہ صرف نبی وامام کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اور کسی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کے ظہور میں صرف خدا کی قدرت اور اسی کے ارادہ داخل ہوتا ہے۔

سوال ۱۲۵: ''معجزہ کرتے ہوئے صاحب معجزہ کائنات میں تصرف کرتا ہے یا خود ذات احدث مستقیما بلا واسطہ معجزہ کو وجود میں لاتا ہے''؟

الجواب: باسمہ سبحانہ ابھی اوپر سوال نمبر ۱۲۴ میں اس کے جواب میں واضح کیا گیا ہے کہ معجزہ کا حقیقی فاعل خدا ہوتا ہے جو مستقیماً نبی یا امام کے مقدس ہاتھوں پر ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا اس طرح صاحب معجزہ کائنات میں کوئی تصرف نہیں کرتا تصرف خدا کرتا ہے اور اس کا اظہار نبی وامام کے ہاتھ پر کرتا ہے۔ اس موضوع کے تفصیلی دلائل اور دوسری تفصیلات معلوم کرنے کیلئے ہماری کتاب احسن الفوائد اور اصول الشریعہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

سوال ۱۲۶: یا علی مدد کہنے سے کیا حضرت علیؑ ہماری ندا، التجا، دعا اور عرض سنتے ہیں؟

الجواب: باسمہ سبحانہ اسلام نے دو اہل اسلام و ایمان کی ملاقات کے وقت جو سلام وجوب مقرر کیا ہے۔ وہ اسلام علیکم یا سلام علیکم اور علیکم السلام یا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ ہے عند الملاقات ایک کا یا علی مدد اور دوسرے کا جواب میں پیر مولا علی مدد کہنا شش امامی فرقہ یا اسماعیلیوں کا مذہبی شعار ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ پنجاب اور سندھ کے بعض علاقوں میں مرسوم ہے۔ اور ویسے بھی اسکے ساتھ جب تک مدد کر یا نہ کر کا تتمہ نہ لگایا جائے۔ تب تک یہ جملہ ادھورا ہے اور ہے بھی بے محل کیونکہ یا صرف حرف ندا ہے۔ آپ کا مخاطب اور شخص ہے اور آپ پکار مولا علی کو رہے ہیں اس

مخاطب کا نام علی نہیں ہے۔ اور مولا علی کا نام حضرت علی ہے یا علی نہیں ہے۔ بہر حال اس فقرہ کی کوئی جول بھی سیدھی نہیں ہے اور نہ ہی یہ شرعی سلام ہے۔ اور نہ ہی شرعی سلام کا قائم مقام ہے۔ اس سوال کا کوئی محل ہی باقی نہیں رہتا ہے کہ مولا علی سنتے ہیں یا نہ؟ جیسا کہ ظاہر ہے لہٰذا اسلامی سلام ہی پر عمل کرنا چاہیئے اور اسی پر اکتفا کرنی چاہیئے۔ واللہ الموفق

سوال ۱۲۷: اگر خطاب محمد و آل محمد علیہم السلام میں کسی ایک کو کیا جائے اور مرکز دین میں اللہ ہو تو کیا ہم ایسا بھی کہہ سکتے ہیں؟ کہ اے مولا علی تجھے واسطہ جناب حسنین کا یا اے جناب فاطمۃ الزہراء تجھے واسطہ جناب سکینہ اور جناب علی اصغر کا میری مدد فرمائیں۔ ان تک ہماری التجا و دعا پہنچتی ہے؟ ان کو خطاب کر کے مرکز اللہ تعالیٰ کو جانتے ہوئے دعا مانگنے کا ان ہی کی تعلیمات کے حوالہ سے ارشاد فرمائیں؟

الجواب: باسمہ سبحانہ دعا و پکار کا مذکورہ بالا طریقہ کار نہ سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کے قول سے ثابت اور نہ عمل سے یعنی نہ انہوں نے اس طرح دعا مانگی تھی اور نہ ہی کسی کو اسطرح دعا مانگنے کی تعلیم دی تھی۔ اور یہ چیزیں بفظلہ تعالیٰ عیاں را چہ بیان کی مصداق ہے۔ بھلا جب یہ حقیقت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ قاضی الحاجات اللہ ہے۔ کائنات کا مرکز اللہ ہے۔ اور مجیب الدعوات اللہ ہے اور سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام اسکی بارگاہ میں وسیلہ ہیں۔ جب ہر مؤمن کا تو دعا بھی کیوں اسی طرح مانگی جائے جو عقیدہ کے مطابق نہ ہو؟ دل میں عقیدہ اور منہ اور زبان پر الفاظ ہوں۔ یہ دو عملی مؤمن کی شان سے بعید ہے۔ لہٰذا کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ زبان کو دل کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ جب خدا مرکز ہے تو دعا و التجا و استدعا میں بہر حال خطاب خدا کو کرنا چاہیئے اور اس دعا میں وسیلہ اور واسطہ ان ذوات مقدسہ کا پیش کرنا چاہیئے۔ جیسے یا اللہ! تجھے واسطہ حضرت نبیؐ و علیؑ مجھے جاگیر جنت عطا فرما اور جہنم سے بچا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہے وہ طریقہ جو انبیاء و مرسلین و اوصیاء اور اولیاء منتخبین اور عباد اللہ الصالحین کا معمول رہا ہے۔ اور قیامت تک رہے گا۔ اس موضوع کی جملہ تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ہماری کتاب اصول الشریعہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

سوال ۱۲۸: ''کیا محمد و آل محمد کا واسطہ دینا یا ان بزرگواروں کو وسیلہ قرار دینا واجب ہے کیا وسیلہ کے بغیر دعا براہ راست اللہ سے مانگنا جائز نہیں؟؟

الجواب: باسمہ سبحانہ بزرگواروں کو وسیلہ قرار دینا ہرگز واجب نہیں ہے اور ان کے توسل کے بغیر بھی خدا سے دعا و استدعا کرنا یقیناً صحیح اور جائز ہے۔ ہاں البتہ ان ذوات مقدسہ کا واسطہ دینا اور ان کے وسیلے سے دعا مانگنا اولیٰ و افضل ہے اور اپنے گناہوں کی وجہ سے روٹھے ہوئے خدا کو منانے اور اس سے دعا قبول کرانے کا تیر بہدف نسخہ ہے و بس۔

☆☆☆☆☆☆

باب المتفرقات

یا امام المنتظرؑ ۔۔۔ العجل العجل

از ڈاکٹر ملک افتخار احمد اعوان سرگودھا

تمام مسلمانانِ عالم اور محبانِ امام العصرؑ منتظرین امام زمانہؑ کی خدمت میں ولادت باسعادت امام زمانہؑ کے پرمسرت موقع پر مبارک باد۔ اور اس دعا کے ساتھ رب کائنات کی بارگاہ میں ملتمس ہوں۔ اے میرے پروردگار بتصدق امام زمانہ

بھیج اُسے جسے پردے میں چھپا رکھا ہے

اور ہمیں اپنے امام کے صحیح حبداروں اور خدمت گاروں میں شمار فرما اور ہمیں اپنے امامؑ کی قدمبوسی کی توفیق عطا فرما۔ آمین بجاہ النبی و آلہ الطاہرین۔

معرفت امام کیوں ضروری ہے:

سرورِ کائنات فخر موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ "من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ جاھلیۃ" یعنی اگر کوئی شخص معرفت امام زمانہ کے بغیر مرگیا تو وہ جہالت کی موت مرا۔

ہمارے وقت کے امام:

ہمارے زمانہ کے امام جن کی ہم رعیت ہیں ان کا اسم گرامی حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف ہے۔ آپؑ کی ولادت باسعادت ۱۵ شعبان المعظم ۲۵۵ھ میں حضرت امام حسن عسکریؑ اور جناب نرجس خاتون کے مقدس گھر میں ہوئی۔ جب آپؑ اس دنیا میں تشریف لائے تو داہنے بازو پر یہ آیت نقش تھی

"جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا"

حق آگیا اور باطل مٹ گیا یقیناً باطل مٹنے والا ہی ہے

خاندانی تعارف:

کسی بھی شخصیت کا تعارف دو انداز سے کرایا جاتا ہے۔ ایک نسبی تعارف اور دوسرا حسبی تعارف۔

امام زمانہؑ کی عظمت اور کمال کا یہ عالم ہے۔ دھدیال کی طرف سے شجرہ نسب اس قدر پاک و پاکیزہ اور عظیم ہے کہ کائنات میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یعنی حضرت علی علیہ السلام اور جناب خاتون جنت تک اور جناب سرور کائنات تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اسی طرح مادری طرف سے بھی بے مثال و بے نظیر شجرہ ہے۔ جو کہ حضرت شمعون وصی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

ولادت باسعادت کے بعد کا منظر:

روایت میں ہے کہ جب حضرت صاحب الامرؑ کی ولادت ہوئی تو آپؑ سے ایسا نور ساطع ہوا جو آفاق آسمان تک پھیل گیا۔ آسمان پر سفید رنگ کے پرندے دیکھے گئے جو آسمان سے نیچے آتے اور اپنے پر و بال حضرت کے سر اقدس اور چہرہ مقدس اور بدن طاہر کے ساتھ مس کرتے اور پھر پرواز کر جاتے۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنی پھوپھی کو آواز

دی کہ میرے فرزند کو میرے پاس لے آؤ میں نے دیکھا کہ حضرت کے دائیں بازو پر لکھا تھا

''جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا''

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو اٹھایا۔ تو انہوں نے اپنے بابا کو سلام کیا پھر حضرت نے فرمایا بیٹا قدرت الہی سے بات کرو اس وقت جناب صاحب الامرؑ نے اعوذ باللہ کے بعد کہا۔

''بسم الله الرحمن الرحیم و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلهم آئمة و نجعلهم الوارثین و نمکن لهم فی الارض و نری فرعون و ھا مان و جنود ھما منهم ما کانوا یحذرون''۔

پھر حضرت نے حضرت رسالتمآبؐ سے لے کر اپنے والد ماجد تک صلوٰت بھیجی جناب حکیمہ خاتون کہتی ہیں۔ کہ چالیس روز گزرنے کے بعد میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت میں گئی جب وہاں پہنچی تو دیکھا کہ ایک بچہ گھر کے اندر چل رہا ہے۔ تو میں نے عرض کی کہ اے میرے سید و سردار یہ دو سال کا بچہ کس کا ہے۔ تو حضرت امام حسن عسکریؑ نے تبسم فرمایا کہ اولاد انبیاء و اوصیاء جو کہ امام ہوں تو وہ دوسرے بچوں سے مختلف نشو و نما پاتے ہیں۔ یہ میرا بیٹا اور تیرا بارہواں امام ہے۔

ہادی کی ضرورت:

ہر زمانہ میں ظلم و ستم کے ستائے مظلوموں کو ایک ایسے رہبر و رہنما کی ضرورت رہتی ہے۔ جو ان کو ظالم کے ظلم سے بچائے یہ فطرت انسانی ہے کہ وہ ایسے ہادی و مہدی کی انتظار میں رہتا ہے۔ جو اس کے لئے ہدایت کا سامان پیدا کرتے اور امن و امان کی چھتری فراہم کرے۔

مقام حیرت ہے۔ کہ عوام الناس کو تو ایسے ہادی کا انتظار ہو مگر کچھ پڑھے لکھے لوگ صرف تعصب و حسد کی بنا پر رسول اعظمؐ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمائے ہوئے حکم اور بتائے ہوئے رہبر و رہنما کو تسلیم نہ کر کے پھر بھی سنتِ پیغمبرؐ کے ٹھیکیدار اور اسلام کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔

البتہ اہل سنت کے بعض مورخین تصور مہدیؑ کے قائل ضرور ہیں۔ لیکن اس حد تک اختلاف کرتے ہیں۔ کہ ابھی مہدی علیہ السلام کی ولادت نہیں ہوئی۔ وہ آخری زمانہ میں تشریف لائیں گے۔ ان کے اس ڈھیلے پوائنٹ سے مرزائیوں نے یہ فائدہ اٹھایا۔ کہ انہوں نے مرزا غلام احمد کو بطور مہدی موعود کے پیش کر دیا۔ چونکہ خود مسلمان پیغمبر خداؐ کے فرمان سے انحراف کر رہے تھے۔ حالانکہ حضرتؐ کا واضح فرمان موجود ہے۔ کہ مہدیؑ میری اولاد یعنی اولاد حسینؑ سے ہوگا۔ میرا ہم نام اور ہم کنیت ہوگا۔ یہ تو نہیں فرمایا تھا کہ ہندوستان کا لوہار ہوگا۔

کاش کہ مسلمان فرمان رسالتؐ کے تحت اس متفقہ تصور مہدیؑ کو فرمان رسالتؐ کی روشنی میں اُسی طرح مان لیتے جس طرح حضرت نے فرمایا تھا۔

حضرت امام زمانہؑ کے وجود مقدس کے بارے بعض شبہات کے جوابات کچھ کوتاہ نظر مسلمان جو موجودگی امام زمانہ کا انکار کرتے ہیں اس کی ایک وجہ صرف یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ ۲۵۵ھ کو ولادت ہو اور اب ۱۴۳۵ھ جا رہا ہے۔ یعنی تقریباً بارہ سو سال ہو چکے ہیں کسی ہستی کی اتنی لمبی عمر کیسے ہو سکتی ہے۔ اور اتنی لمبی غیبت کا کیا فائدہ۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب:

امام زمانہؑ کی ولادت سے لے کر اب تک تقریباً بارہ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ بھلا کوئی شخص اتنی لمبی عمر پا سکتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ اعتراض صرف وہ شخص کر سکتا ہے۔ جو خداوند کریم کو قادر مطلق نہیں مانتا۔ حالانکہ زیادہ تر معترضین وہ ہیں۔ جو ظاہراً خدا کی واحدنیت پر زیادہ کاربند سمجھتے ہیں۔ وگرنہ جو شخص خداوند کریم کو علیٰ کل شیٔ قدیر جانتا اور مانتا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ قادر مطلق نے اپنی قدرت کاملہ سے اب تک بعض انبیاء جیسے حضرت خضر، حضرت ادریسؑ حضرت الیاس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ رکھا ہے۔ تو کیا وہ خدائے قادر مطلق اس آخری حجت خدا کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔

تاریخ میں ایسی ایسی ہستیاں ملتی ہیں جن کی عمریں طویل تھیں۔ مثلاً حضرت آدمؑ کی عمر نو سو تیس سال۔ حضرت شیث کی عمر نو سو بارہ سال بنتی ہے۔ حضرت نوحؑ کی عمر تقریباً پچیس سو سال ہے۔ تو پھر صرف حضرت امام مہدیؑ کی عمر مبارک پر اعتراض کیوں؟

دوسرا اعتراض اور اس کا جواب:

دوسرا اعتراض جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ایسے امام کا کیا فائدہ جسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں نہ ان سے مسائل دریافت کر سکتے ہیں۔ تو اس کا اجمالی جواب یہ ہے کہ امام عصرؑ کی ذات کو صرف مسائل بیان کرنے تک محدود کرنا اپنی ذہنی پستی کے سوا کچھ نہیں۔ وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ

قدم سے مہدی دیں کے زمین قائم ہے۔ پانی پر
قرار کشتی دنیا کے لنگر ایسے ہوتے ہیں

ان کے وجود مسعود کے صدقے میں دنیا قائم ہے۔ محقق طوسیؒ لکھتے ہیں۔ کہ امامؑ کا وجود لطف خداوندی ہے۔ اور ان کا ظاہری تصرف یہ خدا کا دوسرا لطف ہے۔ اور اس تصرف کا نہ ہونا ہماری وجہ سے ہے۔ خود امام زمانہؑ سے پوچھا گیا تھا کہ آپؑ کی غیبت کے زمانہ میں لوگ آپؑ کے وجود مسعود سے کیسے فائدہ اٹھائیں گے۔ امامؑ نے فرمایا تھا کہ جس طرح لوگ آفتاب سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ جب وہ بادلوں کے پیچھے چلا جاتا ہے۔

عظمت امام زمانہؑ:

جب امام زمانہ عجل اللہ فرجہ والشریف کا ظہور پرنور ہوگا۔ اور حضرت فرمائیں گے ''انا بقیۃ اللہ وانا حجۃ'' مومنین کرام انشاء اللہ پہنچنا شروع ہو جائیں گے۔ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ حضرت امام زمانہ بوقت نماز حضرت عیسیٰ سے تقدم برائے نماز کا کہیں گے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے یا حضرت آپ کے ہوتے ہوئے میں نماز پڑھاؤں؟ لہٰذا حضرت حجتؑ نماز پڑھائیں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقتدی بنیں گے۔ یعنی جہاں ایک لاکھ انبیاء کے نقیب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سر ہوگا۔ اُن سے آگے میرے امام زمانہؑ کے قدم مبارک ہوں گے۔ اسی سے میرے امامؑ کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک ضروری وضاحت:

نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام والی روایت سے کچھ لوگ خصوصاً مرزائی حضرات ایک اور شبہ کا شکار ہو کر یہ شور ڈال دیتے ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چونکہ آنا ہے۔ اور وہ نبی ہیں۔ لہٰذا اپنی نبوت کے ساتھ آئیں گے۔ لہٰذا ختم نبوت والا مسلمانوں کا یہ دعویٰ ختم ہو جاتا ہے۔ راقم کی ایک مرزائی سے بحث ہوئی تو

اس نے یہی سوال کیا اور پھر اسی پر اصرار کرتا رہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی ہیں۔ ان کا دوبارہ آنا حضرت محمد مصطفےٰؐ کی ختم نبوت والے دعویٰ کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہی غلام احمد مہدی موعود ہے۔ اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روپ میں آچکا یہ بحث چونکہ بہت لمبی ہے۔ لہٰذا مختصراً اتنا میں نے ثابت کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ظہور امام زمانہ کے بعد تشریف لائیں گے۔ وہ بطور نبی نہیں آئیں گے۔ چونکہ اپنا دورہ نبوت وہ گزار چکے ہیں اب صرف گواہ امامت حضرت حجت علیہ السلام بن کر آئیں گے اور اُن کی امامت کی تصدیق فرمائیں گے۔ نہ کہ خود پھر سے نبی بن کر اپنا عرصہ نبوت گزارنے آئیں گے۔

جشن ولادت امام زمانہؑ کیسے منایا جائے:

پندرہ شعبان المعظم کو ملک کے تقریباً ہر شہر و قصبے میں امام زمانہؑ کی ولادت کے جشن منائے جاتے ہیں۔ خوشی کے جشن کیوں نہ منائے جائیں۔ آخر اپنے امامؑ کے ساتھ والہانہ عقیدت کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چونکہ فرمان معصومؑ ہے۔ کہ ہمارا شیعہ وہ ہے۔ جو ہمارے غم میں غمناک اور خوشی میں خوش ہوتا ہے۔ لیکن مقام فکر یہ ہے کہ جشن کیسے منایا جائے۔ اپنے امام زمانہؑ کے فرمان کے مطابق شرعی حدود وقیود میں رہتے ہوئے منایا جائے یا اپنی مرضی سے۔ جو ذہن میں آئے۔ تو لہٰذا سوچنا پڑے گا کہ اگر تو ہم امام زمانہؑ کے شیعہ ہیں۔ تو پھر خوشی کا طریقہ بھی وہی ہونا چاہیئے۔ جس پر امامؑ راضی ہوں۔ اور اگر ہم شترے بے مہار ہیں۔ تو پھر اپنی مرضی سے جو جی چاہے کرو۔ لیکن امامؑ کی اطاعت والا یہ بدل اتار دو۔

اس وقت آئمہ کے جشن ہائے ولادت منانے کے چند طریقے جو رائج ہیں۔ ان میں سے کچھ کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔ اور پھر قارئین سے انصاف طلب کیا جاتا ہے۔ کہ کون سا درست ہے۔

<u>پہلا طریقہ:</u> جمن شاہی طریقہ۔ ضلع لیہ کے علاقہ جمن شاہ میں ایک ایسا گروہ ہے جو اپنے آپ کو امام زمانہؑ کا بہت زیادہ معتقد تصور کرتا ہے۔ ہر وقت دعا امام زمانہ پڑھنا اور العجل العجل کے نعرے لگانا ان کا شیوہ ہے۔ ان کا سب سے اہم شعار اور مطمع نظر اس بات کے گرد گھومتا ہے۔ کہ "برائی زیادہ کرو تا کہ امام زمانہؑ کا ظہور جلدی ہو" یہ ایک ایسا نعرہ ہے۔ کہ جس میں شیطان بھی اُن کے ہمراہ شامل ہو جاتا ہے۔ چونکہ برائی عام کرنا ہے۔ اور اس بات میں فرمودات ائمہ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کہ جب برائی زیادہ ہوگی۔ ظلم و جور زیادہ ہوگا۔ تو اس وقت امامؑ کا ظہور ہوگا۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ برائی کرنے والے اس وقت کہاں ہوں گے۔ امامؑ کی تلوار کے نیچے ہوں گے یا ہمراہ بہر حال اس گروہ کو مقتدر شیعہ علماء کرام گمراہ اور گمراہ کرنے والے کہتے ہیں۔ چونکہ یہ مسلمات شیعہ کے خلاف ہیں۔

<u>دوسرا طریقہ:</u> بعض درباروں اور گدیوں پر منایا جانے والا جشن:

کچھ عرصہ سے یہ بھی ایک رسم بد نکل چکی ہے۔ کہ بعض درباروں پر اس برے انداز ے سے جشن ولادت منایا جاتا ہے۔ کہ الامان والحفیظ گانے والے اور گانے والیاں بلا کر نشہ شراب میں دھت ہو کر ہر قسم کی فحش حرکات کرنا۔ ہر برائی کرنا۔ اور پھر اسے خوشی کا نام دینا۔ جو کہ انتہائی گھٹیا حرکت ہے۔ جشن ولادت معصوم امام کا ہے اور اس پر ہر غیر شرعی کام کیا جائے۔

<u>تیسرا طریقہ:</u> بانیان مجالس اور ذاکرین کا طریقہ:

یہ طریقہ وہ ہے کہ جس میں بعض بانیان مجالس ذاکرین

کو دعوت دیتے ہیں۔ مجلس و محفل کا سماع بنتا ہے۔ اور ذاکرین بمع اپنے سوزیوں کے مختلف فلمی گیتوں کی دھنوں پر قصائد پڑھتے ہیں۔ بعض خوشی میں دھمال ڈالنا شروع کردیتے ہیں۔ اس طرح ساری رات یہ ہاہو کا عالم رہتا ہے۔

چوتھا طریقہ: عوام الناس کا طریقہ ہے۔

اس طبقہ میں وہ لوگ شامل ہیں۔ جو محفلوں میں تو کم و بیش شریک ہوتے ہیں البتہ گھروں میں چراغاں وغیرہ کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی گانے بجانا ہوائیاں چھوڑنا۔ ہوائی فائرنگ وغیرہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ باقی اس پوری رات میں عبادت خدا سے ان کا دور کا واسطہ نہیں ہوتا۔

پانچواں طریقہ: اس طبقہ میں چند لوگ وہ ہیں جو اپنے آپ کو انتہائی مقدس گردانتے ہیں۔ یا زیادہ ماذرن ہوتے ہیں۔ اگر خداوند کریم انہیں کوئی خوشی دے تو خوش نہیں ہوتے اور اگر غمی کا موقع ہو تو غمزدہ نہیں ہوتے۔ اگر آئمہ علیہم السلام کی ولادت کا جشن آجائے تو وہ خوشی کا اظہار نہیں کرتے۔ اگر محرم آجائے تو ان کے ذہنوں پر اس غم کا بھی اثر نہیں ہوتا۔

چھٹا طریقہ: عقلا کا طریقہ: یہ طریقہ صاحبان عقل و فہم اور صاحبان علم کا طریقہ کار ہے۔ کہ وہ آئمہ کی خوشی میں خوش ہوتے ہیں۔ اور ایام غم میں غمزدہ لیکن خوشی ہو تو بھی آئمہ کے فرمان کے مطابق خوشی کرتے ہیں اور غمی کا موقع ہو تو بھی فرمان پیغمبرؐ کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

عبادت کی رات ہے۔ ساری رات اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ مومنین کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اپنے گناہوں کی مغفرت مانگتے ہیں۔ زیارات امام حسین پڑھتے ہیں۔ جو اعمال صحیحہ آئمہ سے منقول ہیں۔ وہ بجالاتے ہیں۔ اور پھر بوقت سحر اس رات میں صاحب الامر کی ولادت باسعادت ہے۔ اس خوشی میں مومنین آپس میں مبارکباد دیتے ہیں۔ اور خداوند کریم کا سجدہ شکر بجا لاتے ہیں۔ البتہ ایک کام چند لوگ کرتے ہیں۔ کہ سحری کے وقت عریضہ جات لکھ کر آٹے میں بند کرکے نہروں میں پھینکنا یہ روایت کہاں سے چلی۔ بہر حال اس کا کوئی مسلم ثبوت نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی حرکات سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ جو خواہ مخواہ جگ ہنسائی کا سبب بنیں۔

آخر میں دعا ہے کہ خداوند کریم امام زمانہ کے صدقے میں ہمیں امامؑ کے سچے حبداروں میں شمار فرمائے۔ تاکہ لشکر امامؑ میں شامل ہو کر مقصد امامؑ کے لیئے جان نثار کرسکیں۔ انشاء اللہ۔ آؤ مل کر ایک مرتبہ پھر یہی نعرہ لگائیں۔ یا امام المنتظر ۔۔۔ العجل العجل

باب المتفرقات

ماہ رمضان کی اہمیت خطبہ شعبانیہ کی روشنی میں

از قلم مولانا محمد حیات جوادی صاحب مدرس سلطان المدارس سرگودہا

قرآن مجید اور روایات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کی رو سے ماہ رمضان المبارک کو جو فضیلت دوسرے مہینوں پر دی گئی ہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس مہینے میں باقی تمام مہینوں کی نسبت عبادات و مناجات کا تذکرہ زیادہ ملتا ہے۔

اس جلیل القدر مہینے کی عظمتوں اور برکتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شعبان المعظم کے آخری جمعہ کو اپنے ایک طویل خطبے میں بیان فرمایا اور مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا تعین بھی فرمادیا کہ وہ اس مہینے سے جس طرح استفادہ کریں۔ مذکورہ خطبے کے ہر جملے اور لفظ میں حکمت کے موتی چننے کو ملتے ہیں جو انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے کیلئے کافی ہیں۔

ایھا الناس: انہ قد اقبل الیکم شھر اللہ بالبرکۃ والرحمۃ والمغفرۃ. شھر ھو عند اللہ افضل الشھور و ایامہ افضل الایام و لیالیہ افضل اللیالی و ساعتہ افضل الساعات. و ھو شھر دعیتم فیھا الی ضیافۃ اللہ و جعلتم فیہ من اھل کرامۃ اللہ. انفاسکم فیہ تسبیح و نومکم فیہ عبادۃ و عملکم فیہ مقبول و دعائکم فیہ مستجاب.

اے لوگو! بے شک تمہاری طرف اللہ کا مہینہ آرہا ہے۔ یہ برکت رحمت اور مغفرت اپنے ساتھ لایا ہے۔

اس مہینہ کو شہر ''اللہ'' اللہ کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ کیا ماہ شعبان شہر اللہ نہیں ہے؟ کیا محرم اور ذیقعدہ و ذوالحجہ یا شوال یہ سارے کے سارے اللہ کے مہینے نہیں ہیں۔

معلوم ہے کہ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ ساری کی ساری مساجد خانہ خدا ہیں لیکن کیوں خصوصی طور پر یہ مسجد الحرام کو بیت اللہ کہتے ہیں۔

اس لیئے کہ یہ خدا کے نزدیک جو مقام رکھتی ہے اور اسے جو منزلت حاصل ہے وہ دوسری مساجد کو حاصل نہیں۔ اگر چہ وہ بھی خانہ خدا ہیں پس جو چیز خدا کے زیادہ نزدیک ہوگی، اتنا ہی خدا سے اسکی نسبت زیادہ ہوگی مثلاً خدا قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام میں روح پھونکنے کے بارے میں فرماتا ہے: ''نفخت فیہ من روحی'' میں نے آدمؑ میں اپنی روح پھونکی یعنی وہ روح جو آدمؑ میں ہے اسکی خدا کے نزدیک نسبت زیادہ ہے اسی لیئے خدا نے اسے اپنی طرف نسبت دی ہے۔

اسی طرح علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی آنکھ کو عین اللہ کہتے ہیں، یا علیؑ کے ہاتھ کو ید اللہ کہتے ہیں تو یہ اس لیئے کہ علیؑ کا خدا کی طرف تقرب و نسبت عام لوگوں سے بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا ہم علیؑ کے ہاتھ کو خدا کے ہاتھ سے تعبیر کرتے ہیں، دراصل خدا کا تو ہاتھ ہی نہیں خدا تو جسم و جسمانیت سے پاک ہے۔ ہم دست علیؑ کو دستِ خدا سمجھتے ہیں کیونکہ علیؑ کو خدا سے جو نسبت ہے وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی رسول اکرمؐ کے سوا پس جو نسبت ماہ

رمضان کی خدا کے ساتھ اور جو تقرب اور عظمت ماہ رمضان کو حاصل ہے وہ دوسرے مہینوں کو حاصل نہیں۔ اس لیئے خدا نے اس مہینے کو اپنی طرف نسبت دی ہے اور اسے شھر اللہ کہا ہے۔

آگے رسول اکرمؐ فرماتے ہیں: شھر ھو عند اللہ افضل الشھور

یہ مہینہ اللہ کے نزدیک تمام مہینوں سے افضل ہے۔ اس کے دن تمام دنوں سے افضل ہیں اور اسکی راتیں تمام راتوں سے افضل ہیں اور اس کے لمحے تمام لمحات سے افضل کہتے ہیں۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں تمہیں اللہ اپنا مہمان بناتا ہے اور تمہیں اس ماہ میں تکریم الٰہی کا اہل قرار دیا گیا ہے۔ اس مبارک مہینے میں تمہاری سانسیں تسبیح شمار ہوتی ہیں۔ تمہاری نیندیں عبادت قرار پاتی ہیں۔ تمہارے اعمال قبول کیے جاتے ہیں۔ اس مقدس مہینے میں تمہاری دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔

چونکہ اس مہینہ میں دعاؤں کی قبولیت کا خصوصی ذکر ہوا ہے لہذا دعا کے آداب و شرائط کا ذکر کردینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

"دعا کے شرائط و آداب"

ا۔ معرفت: دعا کی ایک شرط خداوند عالم کی معرفت ہے۔ جس کی بارگاہ سے بندہ اپنی دعا کی قبولیت کی اُمید رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص اپنی معرفت کے مطابق اسکی بارگاہ سے فیض حاصل کرتا ہے۔ پس دعا کرنے والے کی معرفت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی اس کا تقرب زیادہ ہوگا اور اس کے رحمت کے خزانہ سے فیض بھی زیادہ حاصل کریگا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے کچھ لوگوں نے سوال کیا "ندعوا فلا یستجاب لنا": ہم دعا کرتے ہیں لیکن ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ حضرت نے فرمایا: لا نکم تدعون من لا یعرفونہ اس لیئے کہ تم جسے پکارتے ہوا سے پہچانتے نہیں۔

رسول اکرمؐ سے منقول ہے کہ: خداوند عالم فرماتا ہے: "من سالنی و ھو یعلم انی اضر و انفع استجیب لہ" جو شخص یہ سمجھتے ہوئے مجھ سے مانگے کہ نفع و نقصان میرے ہاتھ میں ہے تو میں اسکی دعا قبول کرونگا۔

۲۔ قلبی لگاؤ: دعا کی دوسری شرط یہ ہے کہ دعا چونکہ خداوند عالم کہ جو قاضی الحاجات ہے کی بارگاہ میں حاجت کی درخواست اور عرض ہے لہذا دعا کرنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کے دل کو زبان سے کہی جانے والی باتوں کی اطلاع ہونی چاہیئے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں لا یقبل اللہ دعاء قلب لاہ۔ خداوند عالم غافل دل کی دعا قبول نہیں فرماتا۔ انسان کا دل خدا کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور اسے یقین رکھنا چاہیئے کہ اسکی دعا قبول ہوگی۔

عربی دعاؤں کا فائدہ: بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ دعا کرنے والے کو جس دعا کا معنی ہی معلوم نہ ہو اس کا کیا فائدہ؟

کیونکہ دعا کا مقصد حاجت طلب کرنا ہے اور جسے یہ معلوم ہی نہ ہو وہ کیا کہہ رہا ہے اس نے حاجت طلب ہی نہیں کی، پس عربی نہ جاننے والوں کیلیئے عربی کی دعائیں پڑھنا بے فائدہ ہے اور بعضوں نے کچھ مزید جسارت سے کام لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ عمل لغو و عبث ہے۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے ہمیں اپنی دنیا و آخرت کی حاجتوں کیلیئے خالق کی بارگاہ میں دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ہر حاجت کیلیئے ایک مخصوص دعا تعلیم دی گئی ہے کہ ان ہی دعاؤں کو

پڑھیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کریں حتی کہ ایک لفظ کا اضافہ کرنے سے بھی روکا گیا ہے چاہے وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔

شیخ صدوق ''کتاب خصال'' میں اسماعیل بن فضل سے روایت کرتے ہیں: ''سالت ابا عبداللہ (ع) عن قول عز وجل فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل غروبھا'' میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں سوال کیا کہ تم اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بجا لاؤ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے تو حضرت نے فرمایا کہ ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے وہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے دس مرتبہ یہ ر ہے۔

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک و لہ الحمد یحی و یمیت و ھو حی لا یموت بیدہ الخیر و ھو علی کل شئی قدیر۔

یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا و تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کیلئے تمام کائنات کی حکومت ہے اور وہی ہر قسم کی تعریف وستائش کا سزاوار ہے، وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ایسا زندہ ہے کہ کبھی موت نہیں آئے گی اور اسی ہی کے قبضہ قدرت میں ہر قسم کی بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے کہا: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک و لہ الحمد یحیٰ و یمیت و یمیت و یحیٰ تو حضرت نے فرمایا یا ھذا لا شک فی ان اللہ یحییٰ ویمیت و یمیت و یحییٰ و لکن قل کما اقول:

اے شخص اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ یحیی ویمیت بھی ہے اور یمیت اور یحیی بھی ہے لیکن جیسے میں تعلیم دے رہا ہوں اسی طرح پڑھ۔

''معصوم علیہ السلام جب دعا میں اپنی طرف سے اضافہ کو پسند نہیں فرماتے تو نماز و دیگر عبادات میں اضافہ کرنے پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں'' تدبر فلا تغفل

دوسرے یہ کہ اشیاء کی طرح خود الفاظ بھی اپنا ایک خاص اثر و کمال رکھتے ہیں جیسا کہ کچھ عظیم فلاسفہ اور بزرگوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ممکن ہے کہ ایک لفظ میں کوئی مخصوص اثر ہو جو دوسرے لفظ میں نہ ہو اگرچہ دونوں کا معنی ایک ہو۔

ماثورہ دعاؤں کو اس نیت سے پڑھنا کہ یہ معصوم علیہ السلام کی عطا کردہ ہیں، دعاؤں کے قبول ہونے میں اثر رکھتا ہے۔

تیسرے یہ کہ ضروری نہیں ہے کہ دعا کرنے والا ہر ہر لفظ کا معنی جانتا ہو۔ اجمالی طور پر اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ یہ دعا مثلاً طلب رزق کیلئے ہے یہ دعائے توبہ ہے۔ یہ دعائے مکارم اخلاق ہے یہ بیماریوں سے شفا کی دعا ہے۔ پس ان دعاؤں کا پڑھنے والا یہ جانتا ہو کہ وہ خدا سے کیا طلب کر رہا ہے اگر چہ اسے الگ الگ لفظوں کا معنی معلوم نہ ہو۔

چوتھے یہ کہ اکثر دعاؤں میں ہے کہا سے پڑھنے کے بعد اپنی حاجت مانگو۔ اس صورت میں دعا پڑھنے والے نے معصوم سے منقول الفاظ سے تمسک کیا اور خود اپنی زبان میں بھی دعا مانگ لی بشرطیکہ وہ دعا جائز ہو۔

لیکن آئمہ علیہم السلام سے منقول دعائیں بہتر ہیں اور ان کی فضیلت زیادہ ہے اور قبولیت کا امکان بھی زیادہ ہے۔

۳۔ گناہوں سے پرہیز: تیسری شرط یہ ہے کہ انسان گناہوں سے بچے اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے جو شخص اپنی جیسی محتاج مخلوق کا محتاج ہوتا ہے۔ اسکی خوشنودی کیلئے ہزار جتن کرتا ہے، جو

چیزیں اسکی مرضی کے خلاف ہوتی ہیں ان سے دوری اختیار کرتا ہے تا کہ جب وہ اس سے کچھ مانگے تو وہ اسکی حاجت بر لائے۔ پس وہ خدا جو تمام حاجتیں بر لاتا ہے وہ زیادہ استحقاق رکھتا ہے کہ اسکی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کیا جائے۔

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ ابراھیم بن ادھم بصرہ کے بازار سے گزرے تو لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے اور اس سے کہا اے ابراہیم! اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: ''ادعونی استجب لکم'' پس ہم اسکی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں لیکن ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اس نے کہا اے اھل بصرہ تمہارے دل تم میں دس خصلتوں کے پائے جانے کی وجہ سے مر چکے ہیں۔ انہوں نے کہاں وہ کونسی خصلتیں ہیں ابراہیم نے کہا:

۱۔ **عرفتم الله فلم تودحقه:** پہلے یہ کہ تم نے خدا کو پہچانا لیکن اس کے حق کو جیسا کہ اس نے واجب کیا ادا نہیں کیا۔

۲۔ **انکم قرأتم القرآن فلم تعملوا به:** تم نے قرآن کو پڑھا لیکن اس کے مطابق عمل نہ کیا

۳۔ **ادعیتم محبة الرسول و ابغضتم اولادہ:** تم رسول سے تو محبت کا دعویٰ کرتے ہو لیکن اسکی اولاد سے بغض وعداوت رکھتے ہو۔

۴۔ **ادعیتم عداوۃ الشیطان و وافقتموہ:** تم زبان سے شیطان کے ساتھ عداوت اور دشمنی کا دعویٰ کرتے ہو لیکن عمل کے لحاظ سے اسکی موافقت و پیروی کرتے ہو۔

۵۔ **ادعیتم محبة الجنة فلم تعملوا لھا:** کہ تم جنت سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور اسکو حاصل کیلئے تم عمل نہیں کرتے بلکہ اپنے گناہوں کے باعث جہنم کی طرف بڑھ رہے ہو

۶۔ **ادعیتم محافة النار و رمیتم ابدا نکم فیھا:** تم لوگ آگ ''جہنم'' سے ڈرنے کا دعویٰ کرتے ہو حالانکہ تم نے ''اپنی بد عملیوں کی وجہ سے'' اپنے بدنوں کو اس میں پھینک رکھا ہے۔

۷۔ **اشتغلتم بعیوب الناس عن عیوب انفسکم:** تم اپنے عیبوں کو چھوڑ کر دوسروں کے عیبوں میں مشغول رہتے ہو۔

۸۔ **ادعیتم بغض الدنیا و جمعتموھا:** تم دنیا سے نفرت کا دعویٰ کرتے ہو اور خود اسکو جمع کرنے پر لگے ہوئے ہو۔

۹۔ **اقررتم باالموات و لم تستعدولہ:** تم موت کا تو اقرار کرتے ہو لیکن اس کیلئے تیاری نہیں کرتے۔

۱۰۔ **دفنتم موتاکم و لم تعتبرو بھم:** تم اپنے مردوں کو دفن کرتے ہو اور ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے لہٰذا تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

۴۔ __ظلم سے دوری:__ چوتھی شرط یہ ہے کہ بندوں پر ظلم نہ کرے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہم السلام نے فرمایا کہ: خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ کو وحی فرمائی کہ بنی اسرائیل سے کہہ دیں: لا تدخلوا بیتاً من بیوتی الا بقلوبٍ طاھرۃ و ابصارٍ خاشعۃ و اکف نقیة۔ میرے کسی گھر میں طاہر قلوب خاشع آنکھوں اور پاک و پاکیزہ ہاتھوں کے بغیر داخل نہ ہوں اور ان سے کہہ دو کہ: اگر کسی نے میری کسی بھی مخلوق پر ظلم کیا ہوگا تو میں تم میں سے کسی ایک کی دعا قبول نہیں کرونگا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ خدا نے فرمایا ہے: مجھے میری عزت وجلال کی قسم! میں اس مظلوم کی دعا اس پر ہونے والے مظالم کے سلسلہ میں قبول نہیں کرونگا جس نے ویسا ہی ظلم دوسرے پر کیا ہو

۵۔رزق حلال: پانچویں شرط رزق حلال ہے۔ دعا کرنے والے کو یہ توجہ کرنی چاہیئے کہ اس کا رزق حلال ہو اور اس کا پیٹ مال حرام سے بھرا ہوا نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اسکی دعا قبول ہو اسے حلال روزی کمانا چاہیئے۔

حدیث قدسی میں ہے کہ تمہارا کام دعا کرنا ہے ہمارا کام قبول کرنا ہے اور حرام خور کے سوا کسی کی دعا مجھ سے محجوب نہ رہے گی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ترک لقمة الحرام احب الی من صلوة الفی رکعة تطوعاً۔ حرام کے ایک لقمہ کا ترک کرنا میرے نزدیک دو ہزار نماز سے زیادہ محبوب ہے و رد دانق حرام اعدل عند اللہ تعالیٰ سبعین حجة مبرورة اور حرام کے ایک دانق "دانق: درہم کا چھٹا حصہ ہوتا ہے" کا لوٹانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ستر مقبول حج [illegible] برابر ہے۔ حرام [illegible] کو سیاہ کر دیتی ہے۔ اعلیٰ مقامات تک رسائی اور کسب فیض سے محروم کر دیتی ہے۔

۶۔خفیہ دعا: چھٹی شرط دعا کو مخفی رکھنا ہے، انسان کو چاہیئے کہ تنہائی میں بے نیاز کی بارگاہ میں دست نیاز بلند کرے یہ ریا سے دور تر اور اخلاص سے نزدیک تر ہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ: ایک مخفی دعا ستر ظاہر و علانیہ دعاؤں سے بہتر ہے۔ لیکن اگر وہ ریا اور دکھاوے سے محفوظ ہو اور اس کا مقصد صرف و صرف اپنے کو مالک کی بارگاہ میں حقیر و ذلیل شمار کرنا ہو تو مومنین کی دعاؤں سے مدد حاصل کرنا بہتر ہے کیونکہ مومنین کا ایک جگہ جمع ہونا رحمتوں کا نزول اور بہتری و فلاح کا سبب ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے: اگر چالیس افراد ایک جگہ جمع ہو کر دعا کریں تو انکی دعائیں یقیناً مستجاب ہونگی اور اگر چالیس افراد فراہم نہ ہو سکیں۔ چار افراد دس دس مرتبہ خدا کو کسی حاجت کیلیئے پکاریں تو خدا ان کی دعا قبول کرے گا اور اگر چار افراد نہ ہوں، ایک ہی شخص چالیس مرتبہ اللہ کو پکارے تو یقیناً عزیز و جبار اسکی دعا قبول کرے گا۔

۷۔بسم اللہ سے آغاز: ساتویں شرط یہ ہے کہ دعا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرے۔ رسول خدا سے منقول ہے کہ: لا یرد دعاء اوّله بسم الله الرحمن الرحيم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہونے والی دعا رد نہیں ہوتیں۔

☆☆☆☆☆

باب المتفرقات

عالم دین کے لیے اوّلین شرط

علی افضل بشکریہ رسالہ بینات

ایک عالم دین پر دو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، ایک خود اپنی اصلاح کی اور دوسری معاشرے کی اصلاح کی۔ ایک طرف تو اسے اپنے نفس کی تربیت کے لیے اقدام اٹھانا چاہئیں اور دوسری طرف اسے دوسروں کے نفوس کی تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

کیا یہ دونوں ذمے داریاں مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں، اور ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی ربط نہیں؟ ایک ایسا فرد جو خود اپنی اصلاح نہ کرسکا ہو، کیا اس پر اصلاحِ معاشرہ کی ذمے داری عائد ہوتی ہے؟ اور اگر ایک عالم خود اپنے کردار کی تعمیر سے پہلے دوسروں کی تربیت کی کوشش کرنے لگے، تو کیا یہ مقصد حاصل کرسکے گا؟

اس حوالے سے جو جواب رسالۂ علمیہ میں دیا جاتا ہے، وہ بالکل واضح ہے۔ فقہا کا کہنا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی اس بات سے مشروط نہیں ہے کہ نہی عن المنکر کرنے والا ذاتی طور پر خود بھی منکر سے پرہیز کرتا ہو، بلکہ ایسے لوگ بھی جو اپنے فرائض پر عمل نہیں کرتے اور گناہ و نافرمانی کی مرتکب ہوتے ہیں، اُن پر بھی لازم ہے کہ منکرات کے ارتکاب کو دیکھ کر ان سے نہی کریں اور معروفات کو ترک ہوتے دیکھ کر امر بالمعروف کریں۔

لیکن یہ مسئلہ فقہی پہلو سے غور و فکر اور تحقیق کے قابل ہونے کے ساتھ ساتھ، اجتماعی اور معاشرتی پہلو سے بھی تحقیق کا متقاضی ہے۔ ایک ایسا شخص جس میں تقویٰ اور عدالت کی کم از کم شرائط بھی نہیں پائی جائیں، کیا وہ بھاری اجتماعی اور معاشرتی ذمے داریاں اٹھا سکتا ہے؟ اور بڑے پیمانے پر معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں کردار ادا کرسکتا ہے؟

اسی طرح تربیتی پہلو سے بھی یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ ایسے افراد جو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے منصب پر فائز ہونا چاہتے ہیں، کیا وہ ضروری صلاحیتوں کے حصول سے پہلے اس عمل کے مجاز ہوسکتے ہیں؟

ہمارے خیال میں اپنی اصلاح اور دوسروں کی اصلاح کے ان دو فرائض کے درمیان پایا جانے والا ربط، کئی پہلوؤں سے تجزیہ و تحلیل کے قابل ہے۔

۱۔ امر بالمعروف کی تاثیر:

واضح ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے فرائض، دوسروں پر اثر انداز ہونے اور ان کی اصلاح کے لیے انجام دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر تاثیر کے امکانات نہ پائے جائیں، تو امر اور نہی کے فرائض بھی عائد نہیں ہوں گے۔ اس بنیاد پر، کیونکہ خود اپنی اصلاح کے ذریعے دوسروں پر اثر انداز ہونے کا امکان فراہم کیا جاسکتا ہے، تو ایسا شخص جو خود صالح کردار کا حامل نہ ہو، لازماً وہ

دوسروں کی اصلاح میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

لہٰذا جو لوگ امت کی تربیت اور ملت کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں، انہیں اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر خود اپنے اخلاق اور کردار کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے اور اسکے بعد دوسروں کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ کیونکہ جب تک ان کی زبانی دعوت اور کلامی ہدایت، اس دعوت اور ہدایت سے خود ان کی عملی وابستگی کا ثبوت فراہم نہیں کرے گی، اُس وقت تک اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

فقیہ بزرگ علامہ محمد مہدی نراقی، جو اخلاقی و تربیتی مسائل میں گہری مہارت کی بنا پر فقہی مسائل کا جامع ترین انداز میں تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں، فرماتے ہیں: اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو وعظ و نصیحت کے طریقے اور زبان کے ذریعے انجام دیا جائے، تو ایسا شخص جو خود گمراہی اور فریب نفس کا شکار ہو اس پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ لوگ جو اسکی بے راہ روی اور فسق و فجور کا علم رکھتے ہیں، ان پر اس کا کلام اثر نہیں کرے گا اور اس کا وعظ و نصیحت کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

ملا احمد نراقی بھی اپنے والد گرامی کی پیروی میں لکھتے ہیں: اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پند و نصیحت کے عنوان سے کیا جائے، تو اسکے لیے یہ شرط عائد کرنا بعید نہیں کہ یہ عمل انجام دینے والا خود اس گناہ کا مرتکب نہ ہوتا ہو، اور لوگ اسکی طرف سے اس گناہ کے صدور سے واقف نہ ہوں۔ کیونکہ اگر لوگ خود اس گناہ کا مرتکب سمجھتے ہوں گے، تو اس کا وعظ و نصیحت یکسر بے فائدہ اور بے ثمر رہے گا، اور آپ جانتے ہیں کہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر موثر نہ ہو، تو واجب نہیں ہے۔ (معراج السعادۃ۔ ص ۳۹۶)

امام جعفر صادق علیہ السلام کے نورانی کلمات میں سے ایک یہ ہے: مثلا لواعظ والمتعظ کالیقضان و الراقد فمن استیقظ عن رقدته و غفلته و مخالفته و معاصیه صلح ان یوعظ غیره من ذلک الرقاد (واعظ بیدار شخص کی مانند ہے، اور جسے وعظ کیا جا رہا ہو وہ سوئے ہوئے شخص کی طرح ہے اور صرف ایسے ہی شخص کا دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا اور انہیں بیدار کرنا بہتر ہے جو خود خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور گناہ سے پرہیز کرتا ہو۔ بحار الانوار۔ ج ۸۴۔ ص ۱۰۰)

۲۔ منفی اثر:

بے عمل واعظین کے وعظ و نصیحت کا نہ صرف کوئی مفید اثر نہیں ہوتا، یہ دوسروں کی تربیت اور تہذیب نفس کے سلسلے میں کوئی مثبت تاثیر نہیں رکھتا اور اس اعتبار سے فضول اور بے فائدہ ہے، بلکہ بنیادی طور پر ایسے افراد کا تبلیغ دین اور لوگوں کی رہنمائی کے میدان میں قدم رکھنا منفی اور مخرب اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ علمائے دین جو اپنے طرز عمل کی خامیوں اور روحانی کجی کی بنا پر "وعظ و نصیحت" کے ذریعے دین مقدس کی خدمت نہیں کر سکتے، کیا یہی اچھا ہو کہ وہ علما کی صف سے باہر آ کر اور علمائے دین کے القاب و عنوانات سے دستبردار ہو کر دین کی خدمت کریں۔ کیونکہ ان کا یہ عمل دین کے بارے میں لوگوں کی بدگمانی کو کم کرے گا اور اس گروہ کے مخرب اثرات میں کمی لائے گا۔

ایسے بے عمل علما سے یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کی مسند پر آپ کی موجودگی آپ کی ذمے داری ہے، بلکہ اُن کے گوش گزار یہ بات کرنی چاہیے کہ اُن پر واجب ہے کہ وہ علما کی صف سے باہر نکل آئیں اور محراب و منبر کو ترک کر دیں، تاکہ اُن کی دنیا طلبی اور ہوس پرستی کی وجہ سے لوگوں کے درمیان علما کے

مقام اور شان کو نقصان نہ پہنچے۔ اسی بنا پر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی ایک روایت میں اس گروہ کو قطاع الطریقہ (تحف العقول۔ ج ۳ ص ۲۹۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو لوگوں کی ہدایت میں رکاوٹ ہیں، اور جنہوں نے رہزنوں کی طرح لوگوں کی ہدایت کا راستہ بند کر دیا ہے۔

علمائے دین کی گمراہی کے نتیجے میں ایک اور منفی اثر یہ سامنے آتا ہے کہ عوام کا ایک گروہ ان کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ "عالم متھتک" عملاً لوگوں کو بے لگامی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ ایسا عالم، دین سے اپنی وابستگی، روحانیت اور معنویت کا دعویٰ کرتے ہوئے اپنی ناشائستہ باتوں کی توجیہ کر کے لوگوں کو فریب دیتا ہے اور انہیں خطاؤں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: قصم ظهری عالم متهتک و جاهل متنسک فالجاهل یغش الناس بتنسکه و العالم یغرهم بتهتکه۔ (بحار الانوار)

۳۔ امر بالمعروف کی شرط:

فقہی کتب میں امر بالمعروف کرنے والے کے لیے دو شرائط کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک شرط یہ ہے کہ اُسے معروف اور منکر کا علم ہو اور دوسری یہ ہے کہ اُس میں امر اور نہی کرنے کی قدرت پائی جاتی ہو۔ اس بنیاد پر فقہا نے امر بالمعروف کرنے والے کے لیے اخلاقی شائستگی اور عملی آراستگی کو شرائط میں سے قرار نہیں دیا ہے۔ کیونکہ "امر بالمعروف کی ادلہ کے اطلاق" کے پیش نظر یہ ذمے داری تمام ہی لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ حتیٰ اُن لوگوں پر بھی دوسروں کے حوالے سے یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے جو خود احکام الٰہی کا خیال نہیں رکھتے۔ لیکن اہل نظر کے لیے یہ فقہی نظریہ ایک ایسے فتوے کی حیثیت رکھتا ہے جس پر بحث و گفتگو کی گنجائش ہے، اور ممکن ہے کہ فقہی تحقیقات ہمیں اس سے مختلف نتیجے تک پہنچا دیں۔ اس بنیاد پر اس نقطہ نظر کو قطعی اور حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آیت اللہ سید احمد خوانساری، جو مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے خصوصی باریک بینی کا مظاہرہ کرتے ہیں اُن کا اس بارے میں ایک اور نظریہ ہے۔ اُن کے نقطہ نظر کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ: "امر بالمعروف کے لیے شرط ہے کہ امر بالمعروف کرنے والا شخص خود معروف پر عمل کرتا ہو۔ البتہ یہ شرط "شرط واجب" ہے نہ کہ "شرط وجوب"۔ (جامع المدارک۔ ج ۵ ص ۴۰۶)

بہرصورت اس بنیاد امیر المومنین علیہ السلام کے اس کلام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس میں حضرت نے فرمایا ہے کہ: و انهوا عن المنکر و تناهوا عنه و انما امرنا بالنهی بعد التناهی۔ "منکرات سے روکو اور خود بھی بچو کہ تمہیں روکنے کا حکم رکنے کے بعد دیا گیا ہے۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۰۵)

اسی طرح ابن ابی عمیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: امر بالمعروف کی ایک شرط، معروف پر عمل ہے: انما یامر بالمعروف و ینهی عن المنکر من کانت فیه ثلاث خصال: عامل بما یومر به، تارک لما ینهی عنه۔۔۔ (وسائل الشیعہ۔ ج ۱۶۔ ص ۱۵۰)

اگر اس قسم کی شرط کلی صورت میں اور تمام مواقع کے لیے قابل قبول نہ ہو، تب بھی کم از کم یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ لوگوں کے درمیان عالم دین کے بارے میں جو حساسیت پائی جاتی ہے اُسکے پیش نظر اور اس بنا پر کہ اس کا طرز عمل دوسروں کے عقائد اور اعمال پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ وہ

ضروری لیاقت اور شائستگی حاصل کیے بغیر اس میدان میں قدم نہ رکھے اور لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کی ذمے داری قبول نہ کرے۔

۴۔ تربیتی نقطۂ نظر سے:

معاشرے میں ایک عالم دین کا کردار، حکومت کی طرف سے مامور ایک اہلکار کا سا کردار نہیں ہے۔ حکومتی اہلکار شہریوں کے محرک عمل اور اُن کی نیت سے سروکار رکھے بغیر ان سے محض قانون تسلیم کرنے اور اسکی پابندی کا مطالبہ کرتا ہے۔ مثلاً ٹیکس وصول کرنے والا اہلکار ٹیکس وصول کرتا ہے، چاہے ٹیکس دینے والا راضی ہو یا ناراض، ٹریفک پولیس کا اہلکار گاڑی چلانے والوں سے ٹریفک قوانین کی پابندی چاہتا ہے، اور جرمانے جیسے ذرائع استعمال کر کے انہیں ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی سے باز رکھتا ہے۔ البتہ عالم دین لوگوں سے دینی احکام پر عمل تو چاہتا ہے، لیکن حکومتی اہلکاروں سے اس کا فرق یہ ہے کہ عالم دین لوگوں کو قائل کر کے اور اخلاقی تربیت سے استفادہ کر کے انہیں ان کے فریضے کی انجامدہی کی دعوت دیتا ہے۔ عالم دین لوگوں سے عمل صالح کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ لیکن یہ بات اسکے پیش نظر ہوتی ہے کہ عمل صالح بغیر عقیدتی اور اخلاقی بنیادوں کے روبہ عمل نہیں آتا، اور صرف عقیدے کی اصلاح اور باطن میں تبدیلی لا کر ہی کسی انسان سے عمل صالح کی امید رکھی جاسکتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دوسروں میں یہ باطنی تبدیلی پیدا کرنا ان لوگوں کے لیے ممکن ہے جنہوں نے خود ایمان اور اخلاق کا شیریں ذائقہ چکھا ہی نہ ہو۔

اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ عالم دین کی طرف سے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' نیز ''دعوت اور ہدایت'' ایک تربیتی مقصد کے لیے ہے اور جو لوگ یہ ذمے داری اپنے کاندھوں پر اٹھانا چاہتے ہیں، انہیں چاہیے کہ پہلے خود تہذیب نفس، خودسازی اور ضروری لیاقت و قابلیت حاصل کریں۔

فقہ میں عام طور پر امر بالمعروف کے باب میں صرف معروف کی طرف راغب کرنے اور منکر سے روکنے کے دائرے میں بحث ہوتی ہے۔ اور اس عمل کی شکل وصورت پر مبنی یہ نقطۂ نظر اس حد تک آگے بڑھا ہے کہ کہا گیا ہے کہ: اس فریضے کی انجامدہی کے لیے ایسے الفاظ سے استفادہ کیا جائے جو امر اور حکم دینے پر دلالت کرتے ہوں۔ مثلاً یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ غیبت کرنا حرام ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ غیبت نہ کرو۔ یعنی امر بالمعروف کرنے والے کو بلند مقام سے امر اور حکم کرنا چاہیے۔ (تحریر الوسیلہ۔ ج ا ص ۳۹۹)

لیکن یہ بزرگان جب اس مسئلے کا تربیتی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتے ہیں، تو ایک اور طرح کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً امام خمینیؒ اپنی اخلاقی ابحاث میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''لوگوں کی ہدایت و رہنمائی جیسے دینی مقاصد کے لیے نرمی اور ملائمت اہم ترین باتوں میں سے ہے۔ کیونکہ اسکے بغیر یہ عظیم مقصد عملی جامہ نہیں پہن سکے گا۔ خدائے تبارک و تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو حکم دیا کہ: فقولا له قولا لينا لعله يتذكر او يخشى۔ (سورہ طہ ۲۰۔ آیت ۴۴) نرمی اور ملائمت کے ذریعے فرعون کے سخت اور پتھر دل کو بہتر انداز سے ہاتھ میں لیا جاسکتا ہے اور یہ راہ حق کی جانب ہدایت کرنے والوں کے لیے ایک کلی حکم ہے جو دلوں کی تسخیر کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

امام خمینیؒ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں ایک اہم نکتے کی وضاحت کرتے ہیں اور بنیادی طور پر امر اور نہی کو انسان کے لیے تلخ قرار دیتے ہوئے اسے نرمی اور ملائمت کے ذریعے شیریں بنانے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں: ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں ایک اہم نکتہ نرمی اور ملائمت ہے۔ انسان کو امر اور نہی تلخ اور ناگوار گزرتے ہیں اور اس میں غصہ اور حمیت ابھارتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے شخص کو چاہیے کہ اس تلخی اور ناگواری کی اپنی شیریں بیانی اور نرمی و ملائمت اور حسنِ خلق کے ذریعے تلافی کرے، تاکہ اس کا کلام اثر انداز ہو اور گناہگار انسان کے سخت دل کو نرم اور رام کرے۔'' (شرح حدیث جنودِ عقل و جہل۔ ص ۳۱۷، مزید دیکھئے: معراج السعادۃ۔ ص ۳۹۷)

بہر حال کیونکہ عالمِ دین پر لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کی ذمے داری عائد ہوتی ہے، لہٰذا وہ اس مہم کی انجام دہی کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے صرف ان کلی قواعد پر اکتفا نہیں کر سکتا جو عام لوگوں کے لیے ہوتے ہیں۔

۵۔ دعوت کا طریقہ:

ایک عالم کی اہم ترین ذمے داری ''دعوت'' ہے۔ انبیا کے بعد یہ ذمے داری علمائے دین پر عائد ہوتی ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی دعوت پر مامور کیے گئے تھے (اُدع الی سبیل ربک۔ سورہ نحل ۱۶۔ آیت ۱۲۵) البتہ ''دعوت'' امر بالمعروف سے علیحدہ ایک ذمے داری ہے، کیونکہ قرآنِ مجید میں بھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا قرار دیا گیا ہے، اور دو علیحدہ علیحدہ ذمے داریوں کے عنوان سے ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے: و لتکن منک امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۰۴) دعوت کے دوران حق کی قبولیت میں رکاوٹ بننے والے علمی شبہات دور کرنے کے لیے حکمت اور برہان سے استفادہ کرنا چاہیے، لیکن ایسے لوگ جو حق کو پہچانتے ہیں لیکن عملی طور پر نفسانی خواہشات کے اسیر ہونے کی بنا پر اسے تسلیم نہیں کرتے، اُن کے لیے حکمت اور جدال احسن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ بنیادی طور پر ''گفتار'' اُن پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ اس گروہ کو (جو لوگوں کی قریب قریب اکثریت پر مشتمل ہوتا ہے) دعوت دینے کا واحد راستہ، ان کے سامنے مناسب نمونۂ عمل پیش کرنا ہے۔ دینی رہنماؤں اور ائمہ معصومینؑ کی ہدایت و تعلیمات میں اس عمل کو دعوت کا ایک طریقہ ہی نہیں، بلکہ دعوت کا واحد مفید اور موثر طریقہ قرار دیا گیا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابن ابی یعفور کی معتبر روایت یہ ہے کہ: کونوا دعاۃ للناس بغیرا لسنتکم لیروا منکم الورع والاجتھاد و الصلاۃ والخیر فان ذلک داعیہ۔ ''دوسروں کو اپنی زبان کے بغیر دعوت دو۔ جب وہ تمہارے اندر پاکیزگی، راہِ خیر میں سعی و کاوش، نماز اور نیکیوں کا مشاہدہ کریں گے، تو تمہاری طرف مائل ہوجائیں گے۔''

(کافی۔ ج ۲۔ ص ۷۸، مراۃ العقول۔ ج ۸۔ ص ۱۶۵ اور ص ۱۸۶)

اس حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اُن مختلف گروہوں اور فرقوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس دور میں سرگرمِ عمل تھے، اور شیعہ ان کے مقابلے میں ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے، اور امام نے اپنے پیروکاروں کو اس جانب متوجہ کیا ہے کہ ان گروہوں کو اپنی طرف دعوت دینا اور راہ راست کی طرف

اُن کی رہنمائی کرنا زبانی وعظ ونصیحت کے ذریعے کوئی خاص موثر اور کارگر ثابت نہ ہوگا، بلکہ تمہیں چاہیے کہ اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرو، اس طرح وہ خود بخود تمہاری طرف مائل ہوجائیں گے۔ کیونکہ لوگ دوسروں کی زبانی منطق کی بنیاد پر ان کا دکھایا ہوا راستہ اختیار کرنے سے زیادہ، اُن کی عملی منطق سے متاثر ہوکر اُن کی جانب مائل یا اُن سے دور ہوتے ہیں۔

۶۔قائدانہ کردار:

انبیا اور ائمہ کی ذمے داریوں کی پیروی میں عالم دین پر بھی معاشرے میں قائدانہ کردار کی ادائیگی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ وہی کردار ہے جس کا ذکر زعامت، ولایت اور امامت جیسے الفاظ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ شیعی نقطۂ نظر سے امامت امت کے معاملات کی باگ ڈور سنبھالنے کے ساتھ ساتھ دوسرے اجزا و عناصر پر بھی مشتمل ہے۔ اس لفظ میں تمام دوسری چیزوں سے زیادہ اسوہ اور نمونۂ عمل کا مفہوم پایا جاتا ہے، اور ایسی شخصیت جو وسیع معنی میں رہبری اور قیادت کے مقام پر فائز ہو، اُسے اخلاقی اور معنی اعتبار سے نمونۂ عمل ہونا چاہیے۔

امامت کی مختلف ذمے داریوں (جیسے معاشرے کی باگ ڈور سنبھالنا اور اسکی دینی تعلیم وتربیت) کے لیے ایسا ہی فرد لائق اور مناسب ہے، جس میں یہ امتیاز پایا جاتا ہو۔ اس بنا پر اخلاق و کردار کے لحاظ سے برتر شخص ہی اجتماعی اور سیاسی امور میں قیادت کا اہل ہے۔ لہٰذا ایسا شخص جو اخلاقی فضائل سے آراستگی کے لحاظ سے دوسروں سے آگے نہ ہو اور جو ایک اسوہ اور نمونۂ عمل کے طور پر قابل تاسی نہیں، اُسے اجتماعی میدانوں اور منصب واقتدار کے حصول کے اعتبار سے بھی دوسروں سے آگے نہیں ہونا چاہیے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بقول: من نصب نفسه للناس اماما فليبد بتعليم نفسه قبل تعليم غيره۔ (ایسا شخص جو اپنی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتا ہو، وہ ان لوگوں سے زیادہ قابل احترام ہے جو دوسروں کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں قدم اٹھاتے ہیں۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۷۳)

۷۔اقتدار اور طاقت کے خطرات:

اسلامی، بالخصوص شیعہ معاشرے میں علمائے دین ممتاز مقام کے حامل ہوا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اگر وہ تقویٰ کے لحاظ سے مضبوط نہ ہوں، تو انتہائی شدید زوال کا شکار ہوسکتے ہیں۔ عالم دین کو ایک طرف تو معاشرے میں عزت واحترام حاصل ہوتا ہے، اور دوسری طرف اس عزت واحترام کی وجہ سے اسکے لیے اقتصادی اور سیاسی قدرت تک پہنچنے کے لیے راہ ہموار ہوجاتی ہے۔ البتہ ایسے لوگ جو خود اپنے اوپر کنٹرول کے مالک نہ ہوں، اور جنہیں اپنی ہویٰ وہوس پر غلبہ حاصل نہ ہو، اُن کا قوت وقدرت حاصل کرنا انتہائی خطرناک ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا ایسا فرد جسے اپنے اوپر اطمینان اور اعتماد نہ ہو، اسے معاشرتی ذمے داریاں قبول نہیں کرنی چاہئیں۔ صاحب جواہر الکلام، شیخ محمد حسین نجفی نے قضاوت کی بحث میں فرمایا ہے۔ کہ مجتہد جامع الشرائط اگر اپنے اندر یہ دو شرائط موجود پائے، تب اپنے آپ کو قضاوت کی ذمے داری قبول کرنے کا امیدوار قرار دے، اور اس منصب کے لیے اپنی آمادگی کا اعلان کرے۔ ایک شرط یہ ہے کہ وہ ''وثوق بہ نفس'' کا حامل ہو اور اسے اطمینان ہو کہ قضاوت کے دوران جن خطرات کا سامنا ہوتا ہے مثلاً دوسروں کا اثر قبول کرنا اور رشوت کی پیشکش وغیرہ جیسی چیزوں کے سامنے وہ اپنے آپ کو کنٹرول کرسکے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ

اسکی نیت اور ارادہ خالص ہو اور اُس نے کلمہ حق کی سر بلندی کے لیے اس جانب قدم اٹھایا ہو۔ (جواہر الکلام۔ ج ۴۰۔ ص ۴۲)

واضح ہے کہ طاقت وقدرت کے خطرات کا تعلق صرف قضائی معاملات میں حاصل طاقت وقدرت سے مخصوص نہیں ہے، اور محض قاضیوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ کیونکہ عالمِ دین پر بیت المال اور لوگوں کے مال و دولت اور نفوس پر غلبے کی راہ کھل جاتی ہے، لہٰذا اُسے چاہیے کہ سب سے پہلے اپنے اندر قوت مدافعت پیدا کرے، تاکہ اس کا نفس اس پر غالب نہ آجائے۔

۸۔ منبر کے خطرات:

ایسے علما جو اجتماعی اور معاشرتی ذمے داریاں قبول کرنے سے گریز کرتے ہوئے صرف لوگوں کو وعظ ونصیحت میں مشغول رہتے ہیں، انہیں ایک دوسری قسم کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ملا محمد مہدی نراقی نے اس بارے میں ایک مفید یاددہانی کرائی ہے۔ فرماتے ہیں:

''شیطان کے پاس بہت سے بڑے بڑے جال ہیں، جن کے ذریعے وہ اکثر واعظین کو شکار کر لیتا ہے۔ ایسا عالم جو دوسروں کو وعظ ونصیحت کرتا ہے، اسے ان جالوں سے واقف ہونا چاہیے، کیونکہ شیطان وعظ کے موقع پر حاضر ہو کر عالم کی شخصیت کو بے جا طور پر بلند کرتا ہے، اور اسے اسکے علم کی وجہ سے بلند مرتبہ قرار دیتا ہے اور اسکے مقابل اس عالم کی نگاہ میں لوگوں کو پست اور حقیر قرار دیتا ہے۔ بسا اوقات عالم لوگوں کو ذلیل اور پست کرنے اور خود نمائی اور اپنے علم کا اظہار کرنے کی غرض سے لوگوں کو نصیحت کرتا ہے، اور ھذہ آفۃ عظیمۃ تتضمن کبرا و ریا و ینبغی لکل واعظ دین الا یغفل عن ذلک و یعرف بنور بصیرتہ عیوب نفسہ و قبح سریرتہ۔ (جامع السعادات۔ ج ۲ ص ۲۴۷)

منبر ومحراب کے خطرات کی روک تھام کے لیے، تقویٰ اور اخلاص ملحوظ رکھنے کی ضرورت اس حد تک ہے کہ بڑے بڑے علمائے اخلاق نے نصیحت فرمائی ہے کہ اگر واعظ اپنے نفس پر غلبہ اور تسلط نہ پاسکے، تو اسے چاہیے کہ منبر پر جانا اور دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا ترک کر دے۔ مثلاً میرزا جواد آقا ملکی تبریزی، وعظ و ارشاد کے منبر کی اہمیت پر گفتگو کرنے کے بعد اضافہ فرماتے ہیں کہ: ''البتہ وعظ ونصیحت اور جماعت کی امامت کے لیے جس چیز کا دوسری ہر چیز سے زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ وہ اخلاص اور ریا و ریاست سے پرہیز ہے۔ بالخصوص جبکہ وعظ ونصیحت، جو دوسرے اعمال سے زیادہ قدر و قیمت اور فائدے کا حامل ہے، وہ نقصان اور مشکلات قبول کرنے کے حوالے سے بھی دوسرے اعمال سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا جو شخص اس میدان میں قدم رکھے، اگر اسکے پاس رضائے الٰہی اور لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے سوا کوئی اور نیت اور مقصد نہ ہو، تب تو وہ یہ کام کرے، بصورتِ دیگر اسے جہاد بالنفس اور اپنے باطن کی تہذیب کے لیے کوشش کرنی چاہیے، تاکہ اس فریضے کی انجام دہی میں کامیاب ہو سکے۔'' (المراقبات)

۹۔ ترجیح اور اولیت:

مذکورہ بالا نکات کے علاوہ، جن میں سے ہر ایک خود اپنی اور دوسروں کی اصلاح کے درمیان رابطے کی ایک صورت کو بیان کرتا ہے، اور دوسروں کی اصلاح کو اپنی اصلاح کی فرع قرار دیتا ہے، مسئلے کو ایک اور صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

اگر اپنی اور دوسروں کی اصلاح کو دو علیحدہ علیحدہ ذمے داریاں سمجھا جائے، جن میں سے کوئی ایک دوسرے کی فرع نہیں، بلکہ بالکل جدا جدا ہیں، تب بھی اپنی اصلاح کی ذمے داری کو

دوسروں کی اصلاح کی ذمے داری پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ اپنی اصلاح ایک ''واجب مطلق'' ہے، جبکہ دوسروں کی اصلاح ایک ''واجب مشروط''۔ اپنی اصلاح واجب عینی ہے، اور دوسروں کی اصلاح واجب کفائی۔ اور دینی ادبیات میں مسلسل اپنی اصلاح کو دوسروں کی اصلاح کے لیے کوشش پر مقدم قرار دیا گیا ہے۔

اصلاحی عمل کا آغاز اپنی ذات سے ہونا چاہیے، اسکے بعد اقربا اور پھر ان کے بعد عام افرادِ معاشرہ تک اس سلسلے کو پہنچنا چاہیے۔ قرآن مجید کا حکم یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو آتشِ جہنم سے محفوظ رکھو: قوا انفسکم واھلیکم۔ (سورہ تحریم ۶۶۔ آیت ۶) اور امیر المومنینؑ لوگوں سے تقاضا کرتے ہیں کہ اپنے عزیز ترین عزیز (یعنی خود اپنے آپ) کے لیے زیادہ کوشش کرو۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۷۵)

اسی لیے فقہ اور اخلاق میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ سے شروع کرے اور واجبات کی انجام دہی اور محرمات کو ترک کرکے اپنی اصلاح کے لیے کوشش کرے، اسکے بعد اپنے گھرانے اور اعزہ و اقربا کی اصلاح کرے، اور ان کے بعد ہمسایوں اور اہلِ محلّہ کی طرف جائے اور پھر اپنے شہر کی اصلاح کے بارے میں سوچے، بعد ازآں دوسرے شہروں یہاں تک کہ دنیا کے دور دراز گوشوں کے بارے میں اہتمام کرے۔ (کشف الغطاء۔ ص ۴۵۵، تذکرۃ المتقین۔ ص ۱۰۵)

☆☆☆☆☆☆

بقیہ صفحہ نمبر ۳۶

غضب میں لاتی ہے اور کبھی تمہیں خوش کرتی ہے یہ نہ تمہارا گھر ہے اور نہ ہی تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے کہ جس کے لئے تم پیدا کئے گئے ہو اور نہ ہی یہ تمہارے لئے مکان ہے کہ جس کی طرف تم بلائے گئے ہو یہ جان لو کہ نہ ہی یہ دنیا تمہارے لئے ہمیشہ رہے گی اور نہ تم ہمیشہ کے لئے اس میں باقی رہوں گے اگرچہ دنیا تمہیں اپنی زینت اور خوبصورتی کی وجہ سے دھوکا دیتی ہے۔ لیکن برائیوں اور شر کے ہونے سے بھی تمہیں ڈراتی ہے لہٰذا ان ڈرانے والی چیزوں کو جو یہ رکھتی ہے اس کے غرور اور دھوکے میں نہ آؤ اور اس سے دست بردار ہو جاؤ اور اس گھر کی طرف جلدی کرو کہ جس کی طرف تمہیں دعوت دی گئی ہے اور اپنے دلوں کو دنیا سے خالی اور منصرف کرو۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اس حدیث میں دنیا کی حقیقت کس طرح بتلائی گئی ہے کہ یہ فناء ہونے والی اور سفر کی جگہ ہے یہ گزرنے اور سفر کر جانے کے لئے ٹھہرنے کا ایک مقام ہے۔ یہ دھوکے اور غرور اور چالبازی کا گھر ہے۔ انسان اس کے لئے خلق نہیں ہوا بلکہ آخرت کے جہان کے لئے خلق کیا گیا ہے انسان اس جہان میں ایا ہے تاکہ اپنے علم اور عمل کے ذریعے انسانیت کی تربیت اور پرورش کرے اور آخرت کے جہان کے لئے زاد اور توشہ حاصل کرے۔

باب المتفرقات

فضیلت روزہ

تحریر سید اشفاق حسین نقوی جامعہ ولی العصر لیہ

احکام الٰہی میں اہم ترین عبادت جو محسوب ہوتی ہے وہ روزہ ہے۔ روزہ کی اہمیت و ارزش کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یا ایھا الذین آمنو کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ (سورۃ بقرہ ۱۸۳)

روایات میں ہے کہ روزہ کی سختی کو آسان کرنے کے لیے اور مومنین کو روزہ کے لیئے آمادہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یا ایھا الذین آمنو! اے وہ جو ایمان لائے ہو! علاوہ ازیں طریق تبلیغ میں یہ بات بھی ہے کہ ظاہراً مشکل قوانین کو اس طریقہ سے بیان کیا جائے کہ ان قوانین کی سختی آسانی میں بدل جائے جیسا کہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حکم روزہ صرف تم مسلمانوں کے لیئے نہیں بلکہ تم سے پہلے لوگ بھی اس حکم پر عمل کر چکے ہیں۔

تقاضا فطرت ہے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے انسان اس کے انجام پر نظر کرتا ہے انجام جتنا اچھا ہو گا اتنی دل جمعی سے اس کام کو انجام دے گا۔ اس لیئے اللہ تعالیٰ نے روزہ کے حکم کے بعد اس کا نتیجہ بھی بیان کر دیا کہ روزہ اس لیئے ہے تا کہ آپ متقی بن جائیں۔ لعلکم تتقون۔

اور واضح رہے کہ روزہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رزق بچانے کے لیے یا خواہ مخواہ تمہیں مشکل و سختی میں ڈالنے کے لیئے نہیں واجب کیا کیونکہ اس کے خزانے میں کمی کا امکان نہیں۔ کسی پر ظلم کرنا اس کی شان کے خلاف ہے۔ پس اس نے اس لیئے روزے فرض کیئے کہ تم تقویٰ کی دولت سے مالا مال ہو کر دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہو جائیں۔

پیغمبر اسلام فرماتے ہیں کہ جو شخص خاص اللہ کی رجا کے لیے ماہ رمضان کے روزے رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ (تفسیر نور ج ا ص ۳۶۵)

حدیث قدسی میں ہے "الصوم لی وانا اجزی بہ" روزہ میرے لیئے ہیں اور روزے کی جزا میں خود دوں گا۔ تفسیر نور الثقلین ج ا ص ۱۳۶ میں ہے کہ اگر چہ پہلے والی امتوں پر روزے فرض تھے۔ لیکن ماہ رمضان کے روزے انبیاء کے لیے مخصوص تھے۔ لیکن امت اسلامی میں ماہ رمضان کے روزے ہر ایک کے لئے واجب ہیں۔

پیغمبر اسلام فرماتے ہیں۔ کہ ہر چیز کی ایک زکوۃ ہوتی ہے بدن کی زکوۃ روزہ ہے (بحار ج ۶۹ ص ۳۸۰)

نہج الفصاحۃ میں آپ کا ارشاد گرامی ہے۔ اسلام کی اساس پانچ چیزیں ہیں۔

۱۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۲۔ نماز قائم کرنا ۳۔ زکوۃ دینا ۴۔ حج بیت اللہ ۵۔ ماہ رمضان کے روزے۔

رسول خدا نے فرمایا کہ پانچ چیزیں ماہ رمضان میں میری امت کو عطا ہوتی ہیں جو کہ کسی امت کو عطا نہیں ہوتیں

۱۔ جب ماہ رمضان کی شب اول ہوتی ہے تو اللہ نظر رحمت فرماتا ہے پس جو اطاعت خداوندی میں مصروف عمل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ہرگز عذاب میں گرفتار نہیں کرے گا۔

۲۔ عصر کے وقت روزہ دار کے منہ سے جو بو آتی ہے اللہ کے نزدیک وہ مشک کی خوشبو سے بھی برتر ہے۔

۳۔ فرشتے دن رات روزہ داروں کیلئے بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ بہشت کو حکم دیتا ہے کہ میرے بندوں کیلئے تو بخشش کی دعا کر اور ان کیلئے اپنی آرائش کرتا کہ دنیا کی خستگی اور تکلیف انہیں بھول جائے اور وہ میری بہشت و پذیرائی میں آجائیں۔

۵۔ جب ماہ رمضان کی آخری شب ہوتی ہے تو ان کے تمام گناہوں کو بخش دیا جاتا ہے ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ کیا شب قدر میں انہیں نہیں بخش دیا جاتا؟ تو آپ نے فرمایا کیا تم مزدوروں کو نہیں دیکھتے کہ جب کام سے فارغ ہوتے ہیں تو انہیں مزدوری دی جاتی ہے۔ (وسائل الشیعہ ج۵ ص ۶۷)

رسول اکرمؐ نے فرمایا تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ رمضان بہت باعظمت مہینہ ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ اس ماہ میں نیکیوں کو دوگنا کرتا ہے۔

۲۔ گناہوں اور برائیوں کو محو کر دیتی ہے

۳۔ روزہ دار کے درجات بلند فرماتا ہے

۴۔ جو شخص اس ماہ میں صدقہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔

۵۔ جو اپنے مزدوروں اور غلاموں پر احسان کرتا ہے اللہ اسے بخش دیتا ہے۔

۶۔ جو لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے بخش دیتا ہے۔

۷۔ جو اپنے غصہ پر قابو پاتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے بخش دیتا ہے۔

۸۔ جو شخص صلہ رحمی کرے اللہ تعالیٰ اُسے بخش دیتا ہے۔

پھر رسولخدا نے فرمایا یہ مہینہ تمہارے دیگر مہینوں کی طرح نہیں ہے، کیونکہ جب یہ مہینہ آتا ہے تو رحمت و برکت ساتھ لے کر آتا ہے، اور جب جاتا ہے تو گناہ بخش کر جاتا ہے۔

حقیقت میں بدبخت وہ شخص ہے جو اس پورے مہینہ کو گذار دے اور گناہ معاف نہ کرا سکے جس وقت نیک و صالح لوگ اپنے پروردگار سے جزا و صلہ لے کر موفق ہونگے اُس وقت وہ شخص نقصان اٹھانے والا اور افسوس کر رہا ہوگا۔ (امالی صدوق)

پیغمبر اسلام فرماتے ہیں روزہ دار کو دو خوشیاں نصیب ہوتی ہیں۔ ۱۔ ایک افطار کے موقع پر اور ۲۔ دوسری جس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا (اور موفق و کامیاب ہوگا) پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ روزہ دار صبح سے شام تک عبادت الٰہی میں ہوتا ہے جب تک غیبت نہ کرے جب وہ کسی کی غیبت کرتا ہے تو اس کے روزہ کا ثواب جاتا رہتا ہے۔

رسول خداؐ فرماتے ہیں روزہ دار کی نیند عبادت، خاموشی تسبیح اور اس کا عمل دُگنا اور اس کی دعا مستجاب ہوتی ہے اور اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں (آثار و برکات روزہ)

رسول خداؐ فرماتے ہیں روزہ اس وقت تک ڈھال و سپر کا کام کر دیتا ہے جب تک جھوٹ اور غیبت اُسے پھاڑ نہ دیں (آثار و برکات روزہ)

رسول خداؐ فرماتے ہیں۔ روزہ شیطان کے چہرہ کو سیاہ

کر دیتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں گرمیوں میں روزہ داری راہ خدا میں جہاد کرنے کے مترادف ہے

آفات روزہ:

پیغمبر اسلام فرماتے ہیں: کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کا روزہ بھوک و پیاس کے سوا کچھ نہیں (نہج الفصاحۃ)

رسول خداؐ فرماتے ہیں جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت کی غیبت کرے اللہ تعالیٰ چالیس شب و روز تک اسکی نماز و روزہ قبول نہیں کرے گا مگر یہ کہ اُسے وہ شخص معاف کر دے جس کی غیبت کی گئی۔ (توشہ ماہ رمضان ص ۱۰۸)

پیغمبر اسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر تم اسقدر نماز پڑھو کہ کمان کی مانند ہو جاؤ اسقدر روزہ رکھو کہ آپکی کمر خمیدہ ہو جائے۔ اگر اس میں تقویٰ نہ ہوگا تو قبول نہیں ہونگے (بحار ج ۸ ص ۲۵۸)

رسول خداؐ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چند چیزوں سے روکا اور میں نے اپنی اولاد (ائمہ) کو روکا تا کہ وہ اپنے پیروکاروں کو روکیں۔

۱۔ بیہودہ کام ۲۔ نماز میں جلدی کرنا (یعنی تیزی سے پڑھنا صحیح رکوع و سجود ادا نہ کرنا) ۳۔ صدقہ دے کر احسان رکھنا ۴۔ روزہ کی حالت میں گالی دینا ۵۔ قبرستان میں ہنسنا وغیرہ

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ درج ذیل افراد کا روزہ کامل نہیں ہے

۱۔ جو شخص امام وقت کی نافرمانی کرے ۲۔ وہ غلام جو آقا سے بھاگ جائے جبتک واپس نہ آئے ۳۔ وہ عورت جو شوہر کی اطاعت نہ کرے یہاں تک کہ توبہ کرے ۴۔ وہ فرزند جو کہ والدین کا نافرمان ہو جائے یہاں تک کہ فرمانبردار بن جائے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ روزہ حرام کاموں سے پرہیز کرنے کا نام ہے جس طرح انسان کھانے پینے سے پرہیز کرتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں جو شخص ماہ رمضان کا روزہ رکھے اور اپنے دامن و زبان کو گناہوں سے بچائے اور لوگوں کو بھی اذیت دینے سے پرہیز کرے اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اللہ اُسے آتش جہنم سے آزاد کر کے بہشت میں داخل کرتا ہے اور ان گناہگاروں کی نسبت اسکی شفاعت قبول فرماتا ہے جو کہ اہل توحید سے ہوں گے (وسائل الشیعہ ج ۷ ص ۱۷۴)

حضرت زہراؑ فرماتی ہیں جو روزہ دار اپنی زبان و کان و آنکھ اور اعضا و جوارح کی حفاظت نہیں کرتا اُس کے روزے کا کیا فائدہ۔

آثار و فوائد روزہ داری:

۱۔ تقویٰ کے ساتھ روزہ کے دیگر فوائد بھی ہیں حضرت علیؑ فرماتے ہیں علیکم بصیام شهر رمضان فان صیامة جنة حصینة۔

تم پر لازم ہے کہ ماہ رمضان کا روزہ رکھو کیونکہ اس ماہ کا روزہ آتش جہنم سے بچانے والی ڈھال ہے۔ (یا یہ کہ انسان کو تمام خطرات سے محفوظ رکھتا ہے) پیغمبرؐ نے فرمایا یہ مہینہ خود سازی کا مہینہ ہے اور آپ نے روزہ کو ہر عبادت کا دروازہ قرار دیا ہے فرمایا لکل شئی باب و باب العبادة الصوم. ہر چیز کا کوئی نہ کوئی دروازہ ہوتا ہے عبادت کا دروازہ روزہ ہے۔

۲۔ خاندان کے افراد کے درمیان معنویات کے تکامل و رشد کا

باعث ہے خاندان کے افراد ایک دوسرے کی تاسی میں اطاعت و عبادت کرتے ہیں۔ آپس میں اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ قناعت پسندی کی عادت پڑتی ہے اور فقر و فلاکت دور ہوتی ہے۔

۳۔ امام حسن عسکریؑ سے پوچھا گیا کہ روزہ کیوں واجب کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا تا کہ ثروتمند درگرسنگی کو چکھے اور فقیر و محتاج لوگوں کی مدد کرنے کی طرف متوجہ ہوں (کافی ج ۲ ص ۱۸۱)

۴۔ روزہ اسراف و تبذیر کے مقابل ایک دیوار ہے حضرت علیؑ فرماتے ہیں، فقر و تنگدستی بہت بڑی موت اور مصیبت ہے کیونکہ موت کی سختی ایک بار ہے لیکن فقر و تنگدستی کی سختی بے شمار ہوتی ہے۔ لہٰذا انسان قناعت کر کے اسراف و تبذیر سے بچ جاتا ہے اور فقر و تنگدستی سے نجات پاتا ہے۔

۵۔ روزہ ایسا فریضہ ہے کہ انسان کو مادیت پرستی اور حرص و آز میں غرق ہونے سے بچاتا ہے اور انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اپنی خواہشات جسمانی پر دوسروں کی فکر کو مسلط کرے۔

۶۔ پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں: ''صوموا تصحوا'' روزہ رکھو تندرست ہو گے۔ نیز فرماتے ہیں المعدۃ بیت کل داء والحمیۃ رأس کل دواء معدہ ہر بیماری کا گھر ہے اور پرہیز ہر دوا کی اساس ہے۔ (سفینۃ البحار) حدیث نبوی ہے ایاکم و البطنۃ فنھا مفسدۃ للبدن و مورخہ السقم و مکسلۃ عن عبادۃ۔ شکم پوری سے پرہیز کرو کیونکہ پرخوری معدہ اور بدن کے فساد اور مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہونے کی باعث ہے اور عبادت الٰہی سے انسان کو سست و غافل کر دیتی ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا من نعود کثیرۃ الطعام و الشراب قسی قلبہ۔ جو شخص شکم پری کو اپنی عادت بنا لیتا ہے تو اس کا دل سخت ہو جاتا ہے۔ (یعنی وہ گناہوں کی طرف راغب اور عبادت خدا سے روگردانی کرتا ہے) حضرت محمدؐ فرماتے ہیں لا تمیتو القلب بکثرۃ الطعام و الشرب فان القلب یموت کالزرع اذا کثر علیہ الماء۔ اپنے دل کو زیادہ کھانے پینے سے مردہ نہ بناؤ کیونکہ جس طرح زیادہ پانی کی وجہ سے کھیتی خراب ہو جاتی ہے اسی طرح زیادہ کھانے پینے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔

۷۔ روزہ عزت نفس کا درس بھی دیتا ہے۔ انسان ایمان کے ذریعہ ہی ہمیشہ غالب رہتا ہے، اور یہ حق نہیں ہے کہ کسی اپنے جیسے محتاج کے سامنے انسان روٹی و غذا کی خاطر جھکے اور چند ٹکوں کے بدلے اپنے دین ایمان کو بیچ ڈالے۔ لہٰذا روزہ انسان کو یہ مشق کراتا ہے کہ فقر و فاقہ کی بھی اگر چہ نوبت آ جائے۔ پھر بھی پیٹ کی خاطر دین و ایمان کی سودے بازی نہ کرے۔

۸۔ روزہ انسان کو صبر و حلم سکھاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''و استعینو بالصبر و الصلوۃ'' صبر اور نماز کے ذریعے اللہ سے مدد مانگو۔ اور ماہ رمضان کو ماہ صبر کہا گیا ہے۔ حضرت محمدؐ فرماتے ہیں: ''شھر الصبر فان ثوابہ الجنۃ'' ماہ رمضان صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا انجام بہشت ہے۔ انسان اپنی زندگی میں پیش آمدہ امتحانات و مشکلات میں صبر و حلم کے ذریعہ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ اور روزہ انسان کو اس چیز کی مشق کراتی ہے۔

۹۔ انسان میں تقویت ارادہ پیدا ہوتی ہے تواضع و انکساری کی صفت سے مالا مال ہو جاتا ہے گناہوں سے نفرت ہوتی ہے اور کم خوری کی عادت پڑتی ہے جسکی وجہ سے انسان محروم لوگوں کے ساتھ ہمدردی برتتا ہے۔

۱۰۔ انسان کی قوت حافظہ تیز ہوتی ہے، حضرت علیؑ اس بارے میں

فرماتے ہیں۔ کہ تین چیزیں تقویت حافظہ کا موجب ہیں۔

۱۔ مسواک کرنا ۲۔ روزہ رکھنا ۳۔ قرآن پڑھنا

(تلک عشرۃ کاملہ) آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور دیگر مسلمانوں کو اس ماہ کی سعادت نصیب فرمائے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین ثم آمین)

﴿تیرہ رجب﴾

علی کا فکر زمانے میں عام کرو
اے علی والو علی جیسے کام کرو
رام کرنا چاہو اگر کائنات کو تم
علی کے خطبوں سے دنیا کو رام کرو
اگر چاہتے ہو کہ [illegible] جنت عدن
تو زندگی ساری علی کے نام کرو
ولائے علی سے ہے ایمان کی تکمیل
مومنو! علی علی صبح و شام کرو
علی ہی نبی کا خلیفہ بلا فصل
اس میں ہرگز نہ کوئی کلام کرو
بعلیٍ ولیاً و اماماً کہہ کر
دم آخر زندگی کو تمام کرو
اسی میں ہے لوگو انسان کی عظمت
کہ عظمت علی ولی کو سلام کرو
کتنا بابرکت ہے یوم تیرہ رجب
تم بھی جشن ولادت کا اہتمام کرو

﴿کون ہیں؟﴾

کون ہیں علما کے بھیس میں
کہ جن کو اپنا اُلّو سیدھا چاہیئے
دین اگر برباد ہو تو کیا ہوا
ان کو ہر حالت میں پیسہ چاہیئے
جو بنائے قوم کو احمق ترین
اک تماشہ باز ان کو ایسا چاہیئے
صاف کردے ملت بیضا کی جیب
اس طرح کا اک سلیقہ چاہیئے
دین کے نام پر تجارت کیلئے
ایسا تاجر حسب منشا چاہیئے
[illegible] خاک کو اکسیر کردے طرفہ
ان کو اک ایسا خطبہ چاہیئے
علماء سے دور کردے قوم کو
اس طرح کا ایک واعظ، ایسا خطبہ چاہیئے
آج یاں، کل کو ادہر پرسوں وہاں
روز و شب یوں ہی تماشہ چاہیئے
ہے کوئی لبیک کہنے والا یاں
ریش ہو۔ یا سر پہ برقعہ چاہیئے
تیغ در بر اور منہ میں رام رام
ان مداری رہبروں سے بچنا چاہیئے

مولانا صادق حسین نگسی کبیر والا
حال خطیب اسلام والا جھنگ

باب المتفرقات

تمام گناہوں کی جڑ دنیا طلبی ہے

(حصہ دوم)

از کتاب خودسازی مترجم علامہ اختر عباس نجفی مرحوم

روایات میں اولاد اور عیال سے محبت کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ خود پیغمبر علیہ السلام اور آئمہ اطہار اپنے اہل و عیال اور اولاد سے محبت کا اظہار کرتے تھے۔ بعض خوراک کو پسند فرماتے تھے اور ان سے بھی علاقہ کا اظہار کیا کرتے تھے لہٰذا زمین، آسمان، نباتات، درخت، معدنیات، حیوانات اور دوسری اللہ کی نعمتیں نہ قابل مذمت ہیں اور نہ بری اور نہ ہی اہل وعیال اور اولاد اور مال و متاع برے ہیں اور نہ ہی ان سے محبت اور لگاؤ اور دنیاوی زندگی بری ہے بالکل بعض روایات میں تو دنیا کی تعریف بھی کی گئی ہے۔

امیر المومنین نے دنیا کی مذمت کرنے والے شخص کے جواب میں فرمایا کہ دنیا سچائی اور صداقت کا گھر ہے جو اس کی تصدیق کرے اور امن و امان اور عافیت کا اس کے لئے گھر ہے جو اس کی حقیقت کو پہچان لے اور اس کے لئے تونگری کا مکان ہے جو اس سے زادراہ حاصل کرے اور نصیحت لینے کا محل ہے اس کے لئے جو اس سے نصیحت حاصل کرے۔ دنیا اللہ کے دوستوں کی مسجد اور اللہ کے فرشتوں کے لئے نماز کا محل ہے۔ دنیا اللہ تعالیٰ کی وحی نازل ہونے کا مکان ہے اور خدا کے اولیاء کے لئے تجارت کی جگہ ہے انہوں نے دنیا میں اللہ کے فضل اور رحمت کو حاصل کیا ہے اور بہشت کو منفعت میں حاصل کیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ دنیا آخرت کے لئے بہترین مددگار ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جو شخص حلال مال کو حاصل کرنا پسند نہیں کرتا کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی آبرو اور عزت کی حفاظت کرے اور قرض ادا کرے اور صلہ رحمی بجالائے تو اس میں کوئی اچھائی اور بھلائی موجود نہیں ہے۔

لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کونسی دنیا قابل مذمت ہے اور دنیا سے محبت کرنے کو تمام گناہوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے وہ کونسی دنیا ہے؟

میں نے تمام آیات و روایات سے یوں استفادہ کیا ہے کہ دنیاداری اور دنیا کا ہو جانا اور دل دنیا کو دے دینا قابل مذمت ہے نہ کہ دنیاوی امور سے لگاؤ اور دنیا کے موجودات اور اس دنیا میں زندگی گزارنا قابل مذمت ہے۔ اسلام لوگوں سے یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا کو ایسے پہچانیں کہ جیسے وہ ہے اور اتنے ہی مقدار سے اہمیت دیں اور اس سے زیادہ اسے اہمیت نہ دیں۔ جہان کی خلقت کی غرض اور اپنی خلقت کی غرض کو پہچانیں اور صحیح راستے پر چلیں اگر انسان اس طرح ہو جائیں تو وہ اہل آخرت ہونگے اور اگر ان کی رفتار اور کردار اس غرض کے خلاف ہو تو پھر وہ اہل دنیا کہلائیں گے۔

دنیا کی حقیقت:

اس مطلب کی وضاحت کے لئے پہلے دنیا کی اسلام کی رو

سے حقیقت اور ماہیت کو بیان کرتے ہیں اس کے بعد جو اس سے نتیجہ ظاہر ہوگا اسے بیان کریں گے اسلام دو جہان کا عقیدہ رکھتا ہے ایک تو یہی مادی جہان کہ جس میں ہم زندگی کر رہے ہیں اور جسے دنیا کہا جاتا ہے۔ دوسرا اس کے بعد آنے والا جہان کہ جہاں مرنے کے بعد جائیں گے اس آخرت اور عقبیٰ کا جہان کہا جاتا ہے۔ اسلام عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان کی زندگی اس جہان میں مرنے سے ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مرنے کے بعد انسان آخرت کے جہان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ انسان کے لئے اس جہان کو گزرگاہ اور فانی مکان قرر دیا گیا ہے جو آخرت کے جہان جانے کے لئے ایک وقتی ٹھہرنے کی جگہ ہے اور آخرت کے جہان کو دائمی اور ابدی رہنے کی جگہ قرر دیتا ہے۔ انسان اس دنیا میں اس طرح نہیں آیا کہ کئی دن زندگی کرے اور اس کے بعد مر جائے اور ختم اور نابود ہو جائے بلکہ انسان اس جہان میں اس لئے آیا ہے کہ یہاں علم اور عمل کے ذریعے اپنے نفس کی تربیت اور تکمیل کرے اور آخرت کے جہان میں ہمیشہ کے لئے خوش وخرم سے زندگی بسر کرے لہٰذا دنیا کا جہان آخرت کے جہان کے لئے کھیتی اور تجارت کرنے اور زادراہ حاصل کرنے کی جگہ ہے اگر چہ انسان اس جہان میں زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کے لئے مجبور ہے کہ ان نعمتوں سے فائدہ حاصل کرلے یہ انسان کی زندگی کی غرض اور ہدف نہیں ہے بلکہ یہ مقدمہ اور تمہید ہے انسان اور اس جہان کے خلق کرنے کی غرض اور ہدف یہ نہیں کہ انسان یہاں کی زندگی کو خوب مرتب اور پر عیش بنائے اور مختلف لذائذ اور تمتعات سے زیادہ فائدہ حاصل کرے بلکہ انسان کے خلق کرنے کی غرض ایک بہت بلند اور عالی تر غرض ہے یعنی انسان اپنے انسانی شریف جوہر کی یہاں پر پرورش اور تربیت کرے اور اس کی نگاہ اللہ تعالیٰ کی طرف سیر وسلوک اور قرب کو حاصل کرنا ہو۔ جیسے امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ دنیا اس لئے خلق نہیں ہوئی کہ وہ تیرا ہمیشہ کے لئے گھر ہو بلکہ دنیا گزرنے کی جگہ ہے تا کہ نیک عمل کے ذریعے اپنی ہمیشہ رہنے والی جگہ کے لئے زادراہ حاصل کرے لہٰذا تم دنیا سے چلے جانے کے لئے جلدی کرو اور یہاں سے جان کے لئے اپنے لئے سواری آمادہ اور مہیا کرو۔

نیز حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اے دنیا کے لوگو! دنیا گزرنے کی جگہ ہے اور آخرت باقی رہنے کا محل ہے لہٰذا گزرنے والی جگہ سے ہمیشہ رہنے والے مکان کے لئے سامان اور زادراہ حاصل کرو۔ اور اپنے رازوں کے پردے کو اسکے سامنے جو تمہارے رازوں سے واقف ہے پارہ نہ کرو اپنے دلوں کو دنیا سے خالی کرو اس سے پہلے کہ تمہارے بدن اس دنیا سے خارج ہو جائیں۔ تم اس دنیا میں امتحان میں واقع کئے جاؤ گے اور تم اس دنیا سے ماوراء کے لئے پیدا کئے گئے ہو جب انسان مر جاتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ کیا چھوڑ کر گیا ہے اور فرشتے کہتے ہیں کہ کیا لے کر آیا ہے اور کیا اپنے لئے یہاں کے لئے بھیجا ہے؟ خدا تمہارے باپ پر رحمت نازل کرے کہ تم اپنے مال سے کچھ آئندہ کے لئے روانہ کرو تا کہ خدا کے نزدیک تمہارے لئے بطور قرض کے باقی ہوا اور تمام مال دنیا کے لئے چھوڑ کر نہ مرو کہ اس مال کے حقوق تمہاری گردن پر باقی رہ جائیں۔

نیز حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ خبردار کہ یہ دنیا کہ جس کی تم امید رکھتے ہو اور اس سے محبت اور علاقہ مند ہو کبھی تمہیں

بقیہ صفحہ نمبر ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں

باب المتفرقات

اہلبیتؑ کا لغوی و اصلاحی مفہوم و مصداق اور مفسرین کی آراء

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

از مصطفیٰ بہشتی فاضل حوزہ علمیہ قم

جب کسی چیز کا مفہوم معلوم نہ ہو تو اس کے دیگر لوازمات کے بارے میں بحث اور گفتگو کرنا مشکل ہوتا ہے اور مفہوم کی پہچان کے بعد اس چیز کا مصداق متعین ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ یہ صرف ذہنی اور کلی بحث کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوگی۔ بنابریں کسی چیز کے مفہوم اور مصداق کا تعین کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور بہت سے اسلامی مسائل کا تعلق اسی کلمہ کی وضاحت پر منحصر ہے۔ لہٰذا اس کا مفہوم اور اس کے مصداق کا متعین ہونا ایک ضروری امر ہے۔

چونکہ اگر کلمہ اہلبیتؑ کا مفہوم اور مصداق ہمارے لیے واضح ہوگیا تو گویا مرکز علم وحکمت اور مرجع دینی وعلمی ہمارے لئے واضح ہوجاتا ہے چونکہ جو بھی مصداق اہل بیتؑ قرار پائے گا وہی مسلمانوں کا مرجع دینی وعلمی مانا جائے گا۔ حدیث ثقلین کی تناظر میں اگر دیکھا جائے۔ تو یہی اہلبیتؑ ہی ہیں جن کی پیروی کا حکم پیامبر اکرمؐ نے اپنے زبان مبارک سے دیا ہے، حوض کوثر پر ملاقات بھی انہی کے اتباع میں مضمر ہے اور رسول اکرمؐ نے انہی ہستیوں کو قرآن کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ضلالت وتاریکی، اہلبیتؑ کی نافرمانی میں اور فلاح وکامیابی ان کی اطاعت میں منحصر ہے۔ مختصر یہ کہ پیامبر اکرمؐ نے واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ انسان کے لیے دنیاوی اور اخروی سعادت بھی انہی کی پیروی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسی بناء پر مکتب تشیع میں تمام معارف اسلامی چاہے وہ اعتقادات ہوں یا شرعی احکام، اخلاقیات ہوں یا سیاسی واجتماعی مسائل، ان سب امور میں اہلبیتؑ سے راہنمائی لینا واجب ہے اور اسی طرح سیاسی واجتماعی حاکمیت کا حق بھی صرف اہلبیتؑ کے ساتھ مختص ہے چونکہ اہلبیتؑ ہی پیامبر اکرمؐ کے حقیقی جانشین ہیں اور نبوت کے علاوہ رسول اکرمؐ کے باقی تمام منصوبوں کے حامل ہیں اور رسول اکرمؐ کی طرح گناہ اور نسیان سے پاک ہیں۔ ان کا قول فعل اور سیرت بھی رسول اکرمؐ کے قول وفعل اور سیرت وکردار کی طرح حجت ہے۔ اسی بنا پر لسانؐ وحی اور زبان نبوت پر جاری ہونے والے کلمہ "اہلبیت" کے مفہوم اور مصدوق کا تعین کرنا ایک ناگزیر امر ہے۔

لغت میں اہلبیتؑ گھر کے ساکنین کو کہتے ہیں۔ مجمع البحرین اور مفردات راغب میں اس کی تعریف کچھ یوں ہے۔ کسی شخص کے اہلبیتؑ سے مراد وہ افراد ہوتے ہیں جو اس کے خاندان میں سے ہوں اور جو اس کے ساتھ اس کے گھر میں سکونت پذیر ہو۔ راغب اور ابن منظور نے بھی یہی کہا ہے کہ اگر اہلبیتؑ کی اصطلاح بطور مطلق استعمال ہوجائے تو اس سے مراد رسول اکرمؐ کا خاندان ہے۔ یہ تو اس کا لغوی معنی ومفہوم ہے۔

قرآن میں کلمہ اہلبیت کا استعمال:

اہلبیت کا لفظ قرآن کریم میں دو جگہ پر استعمال ہوا ہے۔ ایک حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کے بارے میں کہ جب حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ حضرت سارہ کو خطاب ہوتا ہے: "قالوآ أتعجبين من امر اللہ رحمت اللہ و بركاته عليكم اهل لبيت"۔

ترجمہ: فرشتوں نے کہا کہ کیا تمہیں حکم الٰہی میں تعجب ہو رہا ہے؟ اللہ کی رحمت اور برکت تم گھر والوں پر ہے۔

دوسرا سورۂ احزاب کی آیت (۳۳) میں رسول اکرمؐ کے خاندان کے بارے میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

"انما يريد اللہ ليذهب عنكم الرجس اهل البيت و يطهرهم تطهيرا"

ترجمہ: بس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہلبیت کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ دینی اصطلاح میں "اہلبیت" اور مصداق اہلبیت کیا ہے۔ اہلبیت ایک اصطلاح کے عنوان سے سورۂ احزاب کی اسی آیت کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان رائج ہوا۔ اہلبیت رسول اکرمؐ کا مصداق کون ہے۔ یعنی: دینی اصطلاح میں رسول کے اہلبیت میں کون کون شامل ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین اور علمائے علم کلام کے درمیان اس کے بارے میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ البتہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ تمام شیعہ مفسرین اور علمائے علم کلام کے درمیان اس کے بارے میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ البتہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ تمام شیعہ مفسرین اور اکثریت قریب الاتفاق اہل سنت علماء و مفسرین کے نزدیک امیر المومنین علی، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت امام حسن، اور حضرت امام حسین علیہم السلام اہلبیت کے مصداق ہیں۔ یعنی پنجتن آل عبا یقیناً اہلبیت میں شامل ہیں۔ باقی لوگ مورد بحث ہیں کہ آیا وہ اہلبیت کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں۔ کتب فریقین میں اہلبیت کے مصداق کے بارے میں کلی طور پر چار اہم آراء ملتی ہیں۔

پہلی رائے: اہلبیت سے مراد درج ذیل افراد ہیں: امیر المومنین حضرت امام علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ اور زوجات پیامبر اکرمؐ۔ اکثر مفسرین اہل سنت کا یہی نظریہ ہے۔ یہ مفسرین حضرات پنجتن آل عبا کو اہلبیت پیامبرؐ کے حقیقی مصداق کے طور پر ذکر کرتے ہیں و راس کے ساتھ ساتھ رسول اکرمؐ کی زوجات گرامی کو بھی اہلبیت میں شامل ہونے پر اصرار کرتے ہیں، ان علماء سے نمایاں اور معروف حضرات یہ ہیں: محمد بن جریر طبری جو اپنی تفسیر "جامع البیان عن تاویل ای القرآن" میں سے اسی نکتہ پر زور دیتے ہیں کہ اہلبیت سے مراد پنجتن پاک اور رسول اکرمؐ کی زوجات گرامی ہیں۔

اسی طرح اہل سنت کے مشہور اور معروف مفسر جناب فخر رازی اپنی تفسیر "الکبیر و مفاتیح الغیب" میں اسی نظریہ کو پیش کرتے ہیں کہ اہلبیت سے مراد امام علیؑ، فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور زوجات گرامی رسول اکرمؐ ہیں۔

اہل سنت کے ایک اور معروف مفسر "ثعالبی" اپنی تفسیر "الجواھر الحسان فی تفسیر القرآن" میں یہی لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اہلبیت سے مراد پنجتن آل عبا اور زوجات گرامی رسول اکرمؐ ہیں۔

ناصر الدین بیضاوی جو اہل سنت کے شہرت یافتہ مفسرین میں

سے ہیں، انہوں نے بھی یہی نظریہ اپنی تفسیر، تفسیر البیضاوی، میں پیش کیا ہے۔

یہ ایک نقطہ نظر ہے، جس میں پنجتن آل عبا بشمول زوجات گرامی رسولؐ کو اہلبیتؑ کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔

دوسری رائے: اہلبیت پیامبرؐ سے مراد رسول اکرمؐ کے سارے رشتہ دار ہیں جس میں زوجات، فرزندان اور سارے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب شامل ہیں۔

لیکن ذرا سا غور و فکر کرنے سے اس نقطہ نظر کا بطلان واضح ہو جاتا ہے کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو فضیلت اس آیت میں اہل بیت رسولؐ کے لیے بیان ہو چکی ہے وہ رسول اکرمؐ کے سارے رشتہ داروں کے لیے بھی ہو، حالانکہ رسول اکرمؐ کے رشتہ داروں میں ابولہب بھی آ جاتا ہے جس کی خدا نے صاف الفاظ میں مذمت کی ہے: "تبت یدا ابی لهب و تب" یعنی: ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک ہو جائے۔

اب ابولہب جیسا رسول اکرمؐ کا جانی اور سخت ترین دشمن کیا اہلبیت میں شامل ہو سکتا ہے لہٰذا اس دیدگاہ پر زیادہ بحث و گفتگو کرنا لغو ہے۔ اس نظریہ کو پیش کرنے والوں میں سب سے مشہور علی بن اسماعیل اشعری ہے۔

تیسری رائے: اہلبیت رسول اکرمؐ سے مراد فقط زوجات گرامی پیامبر اکرمؐ ہیں، باقی کوئی بھی اہلبیت میں شامل نہیں۔ محمد بن علی شوکانی، اپنی تفسیر "فتح القدیر" میں لکھتے ہیں کہ بخاری، ابن عساکر، ابن مردویہ، ابن ابی حاتم اسی نظریہ کے طرفدار ہیں۔

البتہ اس نظریہ کا بطلان بھی واضح ہے کیونکہ یہ نظریہ جمہور علماء اہل سنت کے خلاف ہے، جنہوں نے پنجتن آل عبا کے اہلبیت میں شامل ہونے کو لازمی قرار دیا ہے۔ اسی طرح یہ نظریہ روایات متواتر کے بھی برخلاف ہیں جن میں پنجتن آل عبا کو اہلبیتؑ کا مصداق قرار دیا گیا۔ لہٰذا یہ نظریہ فقط مکتب تشیع کے لیے قابل قبول نہیں بلکہ خود اہل سنت کے علماء اور مفسرین بھی اس نظریہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

چوتھی رائے: آیت تطہیر میں اہلبیت رسولؐ سے مراد صرف امیر المومنین امام علی ابن ابی طالبؑ، حضرت فاطمہ زہراؑ، حضرت امام حسنؑ، اور حضرات امام حسینؑ علیہم السلام ہیں اور لفظ اہلبیتؑ کا اطلاق ان کے علاوہ کسی اور پر نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ شیعہ مفسرین رسول اکرمؐ کے اس حدیث متواتر سے تمسک کرتے ہوئے کہ جس میں بارہ "خلفاء" کا ذکر پایا جاتا ہے، امام حسینؑ کے نو فرزندوں کو بھی مصداق اہلبیتؑ قرار دیتے ہیں۔ ہم ان شیعہ مفسرین میں سے چند بزرگ علماء کے کلام کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

شیعوں کے معروف مفسر شیخ طوسیؒ اپنی تفسیر "التبیان فی تفسیر القرآن" میں فرماتے ہیں: اہلبیتؑ سے مراد امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ، فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ، اور امام حسینؑ علیہ السلام ہیں۔

اسی طرح شیعوں کے ایک مشہور مفسر فضل بن حسن طبرسیؒ اپنی تفسیر "مجمع البیان فی تفسیر القرآن" میں لکھتے ہیں: اہلبیتؑ سے مراد پنجتن آل عبا ہیں اور اس کے علاوہ یہ آیت کسی کو شامل نہیں۔

عصر حاضر کے ایک عظیم اور نامور شیعہ مفسر علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ اپنی تفسیر "تفسیر المیزان" میں اسی نظریہ کو بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اہل سنت کے بعض مشہور مفسرین اور برجستہ علمائے بھی اسی نظریہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ علماء حضرات ام سلمہؓ

بقیہ صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں

اخبار غم

×××

۱۔ سید راجے شاہ آف نبی شاہ بالا ضلع سرگودھا رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں مرحوم نہایت دیندار اور پرہیز گار شخصیت کے مالک تھے اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر و اجر سے نوازے۔

۲۔ آہ ملک حسنین حیدر

جناب ملک منظور الحسن اعوان صاحب آف سرگودھا کے جواں سال فرزند ملک حسنین حیدر گزشتہ ماہ عارضہ قلب کی وجہ سے اچانک انتقال فرما گئے اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور والد محترم ملک منظور الحسن صاحب کو جوان بیٹے کی موت پر صبر و حوصلہ عطا فرمائے ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

۳۔ ہمارے مدرسہ جامعہ علمیہ سلطان المدارس سرگودھا کے متعلم قدیر حسین غدیری کے نانا سردار اسد علی جسکانی رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

۴۔ ہمارے مدرسہ کے طالب علم ظہیر عباس دانش کے چچا اصغر علی ولد محمد حسین آف جہانیاں شاہ حرکت قلب بند ہونیکی وجہ سے اچانک انتقال کر گئے ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

۵۔ کوٹلی شمس ضلع سیالکوٹ کے سید رخسار علی شاہ رضوی کو صدمہ شاہ صاحب موصوف کے والد ماجد سید ذاکر حسین شاہ رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کی بخشش فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔

۶۔ جناب الحاج غلام محمد آف پنجگرائیں ضلع بھکر جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرما گئے ہیں مرحوم بڑے نیکوکار اور عزادار سید الشھداء تھے اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

۷۔ جناب حکیم شاہد عباس آف بیڑھ ضلع سیالکوٹ کی والدہ ماجدہ انتقال فرما گئی ہیں اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور جوار جناب سیدہ سلام اللہ علیہا میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

۸۔ سید اظہر حسین آف سیدیں ضلع منڈی بہاء الدین کے بڑے بھائی سید اختر حسین شاہ مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

بقیہ صفحہ ۳۹

" کے حدیث صحیح کو سند قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ ام سلمہؓ کے حدیث صحیح کی بنا پر آیہ تطہیر، پیامبر اکرمؐ، امام علی، فاطمہ زہرا، امام حسن، اور امام حسین علیہم السلام کے ساتھ مختص ہے۔ محمد بن علی شوکانی، اپنی تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں: ترمذی، طبری، ابن منذر اور حاکم نیشاپوری، یہ وہ علماء و مفسرین ہیں جو آیہ تطہیر کو رسول اکرمؐ، امام علیؑ، فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ساتھ مختص جانتے ہیں۔

اہل ایمان کیلئے عظیم خوشخبری

ہم انتہائی مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ حضرت آیت اللہ علامہ شیخ محمد حسین نجفی کی شہرۂ آفاق تصانیف بہترین طباعت کے ساتھ منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

۱۔ **فیضان الرحمن فی تفسیر القرآن** کی مکمل ۱۰ جلدیں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق ایک ایسی جامع تفسیر ہے جسے بڑے مباحات کے ساتھ برادران اسلامی کی تفاسیر کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے مکمل سیٹ کا ہدیہ صرف دو ہزار روپے۔

۲۔ **زاد العباد لیوم المعاد** اعمال وعبادات اور چہاردہ معصومین کے زیارات، سر سے لیکر پاؤں تک جملہ بدنی بیماریوں کے روحانی علاج پر مشتمل مستند کتاب منصۂ شہود پر آگئی ہے۔

۳۔ **اعتقادات امامیه** ترجمہ رسالہ لیلیہ سرکار علامہ مجلسیؒ جو کہ دو بابوں پر مشتمل ہے پہلے باب میں نہایت اختصار وایجاز کے ساتھ تمام اسلامی عقائد واصول کا تذکرہ ہے اور دوسرے باب میں مہد سے لیکر لحد تک زندگی کے کام انفرادی اور اجتماعی اعمال وعبادات کا تذکرہ ہے تیسری بار بڑی جاذب نظر اشاعت کے ساتھ مزین ہو کر منظر عام پر آگئی ہے ہدیہ صرف تیس روپے۔

۴۔ **اثبات الامامت** آئمہ اثناعشر کی امامت وخلافت کے اثبات پر عقلی ونقلی نصوص پر مشتمل بے مثال کتاب کا پانچواں ایڈیشن

۵۔ **اصول الشریعه** کا نیا پانچواں ایڈیشن اشاعت کے ساتھ مارکیٹ میں آگیا ہے ہدیہ ڈیڑھ سو روپے۔

۶۔ **تحقیقات الفریقین** اور **اصلاح الرسوم** کے نئے ایڈیشن قوم کے سامنے آگئے ہیں۔

۷۔ **قرآن مجید مترجم** اردو مع خلاصۃ التفسیر منصۂ شہود پر آگئی ہے جسکا ترجمہ اور تفسیر فیضان الرحمٰن کا روح رواں اور حاشیہ تفسیر کی دس جلدوں کا جامع خلاصہ ہے جو قرآن فہمی کے لئے بے حد مفید ہے۔ اور بہت سی تفسیروں سے بے نیاز کر دینے والا ہے۔

۸۔ **وسائل الشیعه** کا ترجمہ تیرہویں جلد بہت جلد بڑی آب وتاب کے ساتھ قوم کے مشتاق ہاتھوں میں پہنچنے والا ہے۔

۹۔ **اسلامی نماز** کا نیا ایڈیشن بڑی شان وشکوہ کے ساتھ منظر عام پر آگئی ہے۔

منجانب **منیجر مکتبة السبطین** 296/9 بی سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودہا

مورخہ 3,4 اکتوبر 2009ء بروز ہفتہ، اتوار

یہ اجلاس مدرسہ ہذا کے وسیع وعریض پنڈال میں منعقد ہوگا۔ جس میں ملک کے مشہور اور جید علماء وواعظین خطاب فرمائیں گے تمام اہل اسلام سے شرکت کی استدعا ہے

پرنسپل واراکین سلطان المدارس الاسلامیہ سرگودھا